بڈھا کھوسٹ

سعادت حسن منٹو

ساقی بک ڈپو، دہلی ۶

قیمت : اٹھارہ (۱۸/۰) روپے
Rs. 18/-

نام کتاب : بڈھا کھوسٹ
مصنف : سعادت حسن منٹو
اشاعت : ۱۹۸۸ء
طابع : کلر پرنٹنگ پریس، دہلی

ناشر :
ساقی بک ڈپو
A-۴۱۵۷ ، اردو بازار، دہلی ۱۱۰۰۰۶

BUDDHA KHOSAT SAADAT HASAN MINTO

SAQI BOOK DEPOT
4157-A. URDU BAZAR, DELHI-110006

ترتیب

منٹو کا فن

سیّد وقار عظیم

منٹو کا کی حقیقت نگاری، اس کی نفسیاتی موشگافی، اس کی دُور بین و دور رس نگاہ، اس کی جرأت آمیز اور بے باکانہ حق گوئی، سیاست، معاشرت اور مذہب کے اجارہ داروں پر اس کی تلخ لیکن مصلحانہ طنز اور اس کی مزے دار فقرہ بازیوں کی وجہ سے سراہا گیا ہے۔ اور سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور ان سب سے بڑھ کر جنسی زندگی پر اس نے مخصوص اور منفرد انداز سے نظر ڈالی ہے اس پر اسے ملعون کیا گیا ہے۔ اور اس داد تحسین اور ہجو و تضحیک میں لوگوں کا جو رویہ رہا ہے اس میں حق پسندی اور توازن بھی ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ افراط و تفریط کا جذبہ غالب آتا ہے۔ تنقید و تبصرہ کے اس سارے کھیل میں جو بربوں سے منٹو کی زندگی اور اس کے افسانوں کے محور پر کھیلا جا رہا ہے۔ منٹو ایک مثالی ہیرو بھی نظر آتا ہے اور مثالی ولن بھی۔ کچھ نظریں اس بات کی عادی ہو گئی ہیں کہ اسے بس حُسن کا مجسمہ سمجھ کر دیکھیں اور کچھ نگاہوں کو اس میں برائیوں کے سوا کچھ دکھائی

نہیں دیتا۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے۔ تو ان دونوں طرح کے دیکھنے والوں کو جذباتی شدت پسندی نے اصل حقیقت تک پہنچنے اور اس کے کھوٹے کھرے کو پہچاننے کا موقع نہیں دیا۔

دنیا کی ہر چیز کی طرح منٹو نہ "محض" اچھا ہے اور نہ "محض" برا۔ اس کے افسانے نہ خالصتاً حسن و جمال کے مظاہر ہیں اور نہ محض برائیوں کے حامل۔ اس کی حقیقت نگاری، اس کی نفسیاتی موشگافی، اس کی دوررس اور دور بین نظر، اس کی جرأت آمیز حق گوئی، اس کی تلخ مصلحانہ طنز اور اس کی شگفتہ فقرہ بازی کے اچھے اور برے دونوں پہلو ہیں۔ کبھی بہت برے۔

ان اچھے برے اور کبھی کبھی بہت اچھے اور بہت برے پہلوؤں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ تو سب سے پہلے انسان کی نظر ان بے شمار موضوعات پر پڑتی ہے۔ جن تک منٹو کی نظر پہنچی ہے۔ کلرک، مزدور، طوائف، رند خرابات اور زاہد پاکباز، کشمیر یا بمبئی، دہلی، لاہور، فلم اسٹوڈیو، کالج، بازار، گھر، ہوٹل، چائے خانے، بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں، مرد اور ان سب کی ذہنی الجھنیں اور ان ساری چیزوں سے بڑھ کر جنس اور اس کے گوناگوں مظاہر منٹو کے موضوعات ہیں۔

ان موضوعات میں سے بعض منٹو کو زیادہ عزیز ہیں۔ بعض کوچوں میں پہنچ کر اس پر جو سرشاری طاری ہوتی ہے۔ وہ دوسری جگہوں پر نظر نہیں آتی اور بعض افراد کا ذکر وہ جس ادائے خاص سے کرتا ہے۔ وہ ادا ہر موقع پر نمایاں نہیں ہوتی اور بعض باتیں کہنے اور بعض رموز

آشکارا کرنے میں اسے جو مزا آتا ہے۔ وہ دوسری باتیں بکتے اور کرتے وقت شاید محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن ذکر کسی کوچے کا ہو اور کسی بات کا ہو۔ یہ کہیں نہیں معلوم ہوتا۔ کہ منٹو اس کوچے کے سارے پیچ و خم، اس شخص کے دل کے سارے بھید اور اس بات کی ساری نزاکتوں اور لطافتوں سے واقف نہیں جہاں تک ان گوناگوں موضوعات کا تعلق ہے۔

اس کے سلسلہ میں ایک اور چیز بھی سامنے آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ بعض موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دے کر منٹو نے بہت سوں کی دل آزاری کی ہے۔ بہت سوں کی برائی مول لی ہے۔ اور بہت سوں کی گالیاں سنی ہیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بہت سے پڑھنے والوں نے ان ہی گالیوں کو معیار بنا کر منٹو کے فنی مرتبہ کا اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے اور یہ بات بہت کم کہی گئی ہے اور اکثر دبی زبان سے کہی گئی ہے کہ افسانہ نگار کی حیثیت سے منٹو کو پہچاننے کے لیے اس کے فن پر سب سے پہلے نظر ڈالنی ضروری ہے۔ اس لیے کہ منٹو کی افسانہ نگاری میں ان موضوعات کی بھی اہمیت ہے۔

جن کا منٹو نے پوری فنی ذمہ داری سے انتخاب کیا ہے۔ اور اس لحاظ کی بھی اہمیت ہے۔ جو ان موضوعات کے انتخاب کا ذمہ دار ہے۔ لیکن حقیقت میں جس چیز نے منٹو کو منٹو بنایا۔ جس چیز نے اسے وہ بڑائی دی۔ جس میں کوئی دوسرا افسانہ نگار اس کا ہمسر نہیں۔ وہ اس کا فن ہے اور منٹو کی شخصیت اور اس کی افسانہ نگاری کے خواہ کسی پہلو پر کچھ لکھا جائے۔ اس کے فن کا ذکر ناگزیر ہے اور جب ہم یہ کہتے ہیں۔ فن کا ذکر ناگزیر ہے تو ہماری مراد یہ ہوتی

ہے کہ منٹو نے جو بے شمار باتیں اپنے افسانوں کے ذریعے اپنے پڑھنے والوں تک پہنچائی ہیں۔ ان کے اظہار کا اسلوب کیا ہے۔ اور اس اسلوب کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔

لیکن اس بات کا جائزہ لینے سے پہلے کہ منٹو کی افسانہ نگاری کا فن کیا ہے اور منٹو کے اسلوب فن کی کیا حدیں ہیں۔ شاید اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جب منٹو کے موضوعات اور اس کے نقطۂ نظر سے الگ ہم اس کے فن کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں فن کا مفہوم کیا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلی چیز جو منطقی طور پر بحث کرنے والے کے سامنے آتی ہے۔ تکنیک کے وہ مبادیات اور مطالبات ہیں جو ادب کی ایک صنف اور دوسری صنف میں مابہ الامتیاز سمجھے جاتے ہیں۔

داستان، ناول، ڈراما اور افسانہ بنیادی طور پر کہانی ہونے کے باوجود تکنیک کے اصول و قواعد کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اچھا داستان گو، ناول نگار، ڈرامیٹسٹ اور افسانہ نگار داستان، ناول، ڈراما یا افسانہ لکھتے وقت ان اصول و قواعد کی پابندی کو اپنا فرض اولین جانتا ہے۔

ایک خاص صنف ادب کے ساتھ اس نے جو رشتہ قائم کیا ہے۔ اس کے خلوص اور صداقت کا تقاضا ہے کہ وہ صنف ادب کے ان امتیازی اصول و قوانین سے پوری طرح واقف ہو کر انہیں پوری طرح برتے۔ ان اصول و قواعد کو جن کا دوسرا نام اس صنف کی تکنیک اس کی روایات یا اس کا فن ہے۔ جاننا، سمجھنا اور ان کا صدق دل سے احترام کرنا اس رشتہ کا پہلا مطالبہ ہے۔

جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا۔ اس لئے کسی فنکار کے فن کا جائزہ لینے کی پہلی منزل یہی یہ دیکھنا ہے۔ کہ اس فنکار نے فن کے ابتدائی مطالبات کو، ان اصول و قوانین کو اس کی روایات کو کس حد تک جانا، سمجھا، محترم جانا اور اپنے فن میں برتا ہے۔

فنی جائزہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ فنکار نے فن کی روایات کی پابندی کرنے کا حق ادا کر کے اپنے خیال اور احساس کو دوسروں تک پہنچانے کے کیا کیا وسیلے استعمال کیے ہیں۔

ان مختلف وسائل کے استعمال میں فنکار کے تخیل، فکر اور ذہنی کاوش اور انہماک و توجہ کو خاصا دخل ہوتا ہے۔ اس لیے جو فنکار اپنے فن کو جس حد تک زیادہ عزیز رکھتا ہے اور جس حد تک اسے اس فن سے اپنے رشتہ اور تعلق کا احساس زیادہ گہرا اور شدید ہوتا ہے۔ اسی حد تک اس کی توجہ، انہماک اور ذہنی کاوشوں کی بدولت اظہار اور ابلاغ کے اچھے سے اچھے اور نئے سے نئے وسیلے اس کے ہاتھ آتے ہیں۔

اظہار اور ابلاغ کی یہی منزل ہے جہاں مصنف کا تخیل اور فکر جو حقیقت میں اس کی شخصیت کے مختلف اجزا اور عناصر ہیں۔

اظہار اور ابلاغ کے وسائل میں نئے نئے رنگ بھرتا ہے۔ یہی رنگ مصنف کے انداز اور اسلوب کی خصوصیت کا مظہر ہے اور اسے اس فنی جائزہ کا ایک اہم جز سمجھا جاتا ہے جس میں فنی روایات اور اظہار ابلاغ کے دوسرے وسائل شامل ہیں۔

فنی جائزہ لیتے وقت اور اس جائزہ کی بنا پر فنکار کے فنی مرتبہ کا اندازہ لگاتے وقت چند اور باتیں بھی ایسی ہیں جو پیشِ نظر نہ رکھی جائیں تو یہ فنی جائزہ ادھورا رہتا ہے۔

ان میں سے ایک بات تو یہ ہے کہ فن کار اپنے انہماک، توجہ اور کاوش سے اظہار کے وسائل میں جو نئے نئے پہلو پیدا کرتا ہے۔ اور اپنی شخصیت کی قوت اور انفرادیت سے جو رنگ بھرتا ہے۔

ان پہلوؤں کا تیکھاپن اور اس رنگ کی شوخی ہمیشہ قائم نہیں رہتی۔ فن کار کے اعصاب ایک خاص منزل پر پہنچ کر اس کی شخصیت کے مختلف عناصر پر انتشار کا غلبہ ہوتا ہے تو فن کا رنگ بھی پھیکا پڑنے لگتا ہے۔ یہ باتیں فنی جائزہ لینے والا نظرانداز نہیں کر سکتا۔

اس لیے کہ ان حقائق کو پیشِ نظر رکھے بغیر فنکار کے فن کے ارتقا کا سراغ لگانا ممکن نہیں۔

اس سلسلہ کی دوسری اہم کڑی یہ بات ہے کہ گو شخصیت کے عناصر کے انتشار کے ساتھ ساتھ فن میں انحطاط پیدا ہونا لازمی ہے۔ لیکن فن کار کو فن کے ساتھ ایک خاص مدت تک تعلق رکھنے کی بنا پر اظہار کے وسائل پر ایک قدرت حاصل ہو جاتی ہے اور یہ قدرت اس کی شخصیت کے انتشار اور انہماک اور کاوش کی کمی کے باوجود اس کے اسلوبِ اظہار میں ان عناصر کو باقی اور قائم رکھتی ہے جو اس کے فن کی امتیازی خصوصیت سمجھے جاتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ یہ عناصر ہمیشہ ظاہر ہونے کے بجائے صرف کبھی کبھی ابھرتے اور اندھیرے

میں چمک دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں۔

منٹو کے افسانوی فن میں فن کے یہ سارے مدارج بدرجۂ اتم موجود ہیں اس کے فن نے یہ ساری منزلیں جس طرح طے کی ہیں۔ اُردو کے کسی اور افسانہ نگار کے یہاں ان کا سُراغ نہیں ملتا۔

افسانہ، ناول، ڈرامہ، داستان، کہانی ان سب میں بعض عناصر مشترک ہیں۔ کوئی نہ کوئی واقعہ اس قصّے سے تعلق رکھنے والے کردار، واقعہ کی ابتدا اور اس کے خاتمہ تک اس کے مختلف مدارج، مصنّف کا ایک مخصوص اندازِ فکر و نظر یہ سب کچھ اس کہانی میں بھی ہوتا ہے جو چوپال میں بیٹھنے والے بڑی سادگی سے ایک دوسرے کو سناتے ہیں۔ اس کہانی میں بھی جو بڑی بوڑھیاں رات کی خاموشی میں بچوں کو سناتی ہیں۔

اس افسانے، ناول اور ڈراما میں بھی جو فن کے پورے احساس کے ساتھ لکھا جاتا ہے لیکن ان کئی مشترک پہلوؤں سے قطع نظر کہانی کی ان مختلف اصناف میں سے ہر ایک کی ایک نہ ایک امتیازی خصوصیت بھی ہوتی ہے۔ جو اسے دوسری صنف سے منفرد کرتی ہے۔

داستان میں تخیل اور تصوّر کی رنگینی، ڈرامے میں کوئی نہ کوئی کشمکش ناول میں زندگی کی وسعت اور گہرائی اور افسانہ میں موضوع کی اکائی بڑا امتیازی اور انفرادی خصوصیات ہیں۔

افسانہ دوسری طرح کی کہانیوں سے اسی لحاظ سے منفرد اور ممتاز ہے کہ اس میں واضح طور پر کسی ایک چیز کی ترجمانی اور مصوّری ہوتی ہے۔ ایک

کردار، ایک واقعہ، ایک ذہنی کیفیت، ایک جذبہ، ایک مقصد، مختصر یہ کہ افسانے میں جو کچھ بھی ہو، ایک ہو، عام طور پر افسانہ نگار افسانہ کی اس بنیادی خصوصیت کی طرف سے غفلت برت کر افسانہ لکھتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افسانے پڑھنے والے کے ذہن پر وہ گہرا تاثر قائم نہیں کر سکتے جو ہر اچھے افسانہ کے ساتھ وابستہ ہونا چاہیے۔

اُردو کے افسانہ نگاروں میں پریم چند نے اکثر افسانہ کی امتیازی خصوصیت کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ لیکن کبھی کبھی جذبات کی رو میں بہہ کر ان سے بھی اس معاملہ میں ان سے کوتاہی ہوئی ہے۔ ایک فنکار کی حیثیت سے منٹو نے اپنی پوری فنّی زندگی میں کبھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا۔ کہ انہیں اپنے افسانہ میں کوئی ایک بات کہنی ہے اور اس طرح پڑھنے والے کے ذہن پر ایک خاص تاثر قائم کرنا ہے۔

ان کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے افسانہ کا مطالعہ کرنے کے بعد پڑھنے والے کے سامنے بے شمار چیزیں آتی ہیں۔ یعنی منٹو کا ہمہ گیر مشاہدہ جس ماحول پر اپنی نظر ڈالتا ہے۔

اس کے باریک سے باریک پہلو کو نظر میں رکھ کر اسے اپنے افسانہ کا پس منظر بناتا ہے واقعہ اور کردار کے ذکر میں منٹو بہت کم اس جرم کے مرتکب ہوئے ہیں کہ وہ واقعہ اور کردار کی پوری تفصیلات پر عبور حاصل کئے بغیر اس کے متعلق کچھ کہنے کی کوشش کریں۔

لیکن ایک مخصوص ماحول یا کردار کے ہر پہلو اور اس کی ہر فردی اور

جزوی کیفیت سے پوری طرح واقف ہونے کے بعد بھی وہ اِس ماحول یا کردار کی مصوری کو اپنی افسانہ نگاری نہیں بناتے۔

یہ سارا عمل عموماً ایک مخصوص تاثر پیدا کرنے کے لیے پس منظر یا وسیلہ کا کام دیتا ہے لیکن حقیقت میں اِس پس منظر کے پیچھے کوئی ایک تاثر، جذبہ، ذہنی کیفیت موجود ہوتی ہے جسے سامع یا ناظر کے ذہن تک پہنچانا افسانہ نگار کا مقصود ہے۔ مثلاً ان کے افسانے نیا قانون، خوشیا، نعرہ، اور نیا سال پڑھ کر پڑھنے والا افسانہ نگار کے مشاہدے، اس کے تخیل، فکر اور تجزیہ جات کی بدولت بے شمار چیزوں کا عکس اپنی آنکھوں کے سامنے محسوس کرتا ہے۔

لیکن ان بے شمار چیزوں کا مشاہدہ مجموعی طور پر اس کے ذہن میں ایک خاص کردار کی ذہنی کیفیت کا نقش بٹھاتا ہے۔

افسانہ پڑھتے وقت ایک نئے ماحول اور ایک نئی فضا کی ان گنت تصویریں اس کی نظر کے سامنے آتی اور رخصت ہوتی رہتی ہیں۔ اور ان سے حسب موقع پڑھنے والا لطف و حظ محسوس کرتا رہتا ہے۔ لیکن افسانہ ختم کر چکنے کے بعد افسانہ نگار کے مصورانہ قلم کے بنائے ہوئے یہ بے شمار نقش رخصت ہو جاتے ہیں اور خود رخصت ہوتے وقت صرف ایک چیز پڑھنے والے کے ذہن پر چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ چیز نیا قانون، خوشیا، نعرہ، اور نیا سال، کے مرکزی کردار کی ایک مخصوص ذہنی کیفیت ہے۔ یہ سب افسانے اپنی واقعاتی اور نفسیاتی رنگا رنگی کے باوجود مجموعی حیثیت سے صرف اس گہرے تاثر اور اس جذباتی

کیفیت کے ترجمان ہیں۔

جس میں ایک خاص فرد مبتلا ہے۔ (منتر) اور دیرا اور اس کا انتقام، اپنی دلچسپ اور رومانی تفصیلات کی بنا پر شروع سے آخر تک پڑھنے والے کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ ان افسانوں میں جو کردار پڑھنے والے کے سامنے آتے ہیں ان کی ایک ایک بات میں ان کے مخصوص مزاج اور اس مزاج کی منفرد خصوصیات کا عکس ہے لیکن افسانہ پڑھ چکنے کے بعد پڑھنے والا جس چیز کا سب سے زیادہ نمایاں اثر قبول کرتا ہے۔ وہ صرف ایک واقعہ ہے۔

ایک صورت میں واقعہ کی ہلکی پھلکی ہنسا دینے والی کیفیت اور دوسری صورت میں رومان اور مزاج کا ایک ملا جلا تاثر پڑھنے والے کے ذہن پر ہر دوسری چیز کے مقابلہ میں اپنا نقش چھوڑ کر جاتا ہے۔

اسی طرح "ہتک" ایک مخصوص ماحول اور فضا اور اس ماحول اور فضا میں رہنے بسنے والے گوناگوں کرداروں کی انفرادیت کا نقش ہونے کے باوجود مجموعی طور پر "ہتک" کی ہیروئن "سوگندی" کے کردار کی ایک مکمل تصویر ہے۔

وہ ساری فضا جو افسانہ نگار نے مشاہدہ، تخیل اور فکر کی پوری قوتوں سے کام لے کر تخلیق کی ہے اور وہ سارے کردار جن کی مدد سے اس فضا کا مخصوص رنگ واضح ہوتا ہے مل جل کر "سوگندی" کے کردار کو مکمل کرنے میں حصہ لیتے ہیں اور اس طرح افسانہ میں بہت کچھ ہونے کے باوجود "سوگندی" ہی سب کچھ ہے۔ افسانہ ختم کرنے پر ہم "سوگندی" کے علاوہ باقی سب چیزوں کو، باقی کرداروں کو بھول جاتے ہیں۔

وہ گرد و پیش کی ہر چیز پر غالب آ کر اس طرح چھا جاتی ہے کہ ہمارے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ ہی نہیں کہ صرف "سوگندھی" کو یاد رکھیں اور اس طرح یاد رکھیں جیسے ہم برسوں سے اسے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ اس کی ہر چھوٹی بڑی بات اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اور اس کے دل کا ہر راز ہمارا راز ہے۔

منٹو کی افسانہ نگاری فن کی مختلف منزلوں سے گزری ہے۔ ان منزلوں میں سے بعض منزلیں ترقی کی ہیں اور بعض تنزل کی۔ لیکن ان میں سے ہر منزل میں منٹو نے اپنے اس منصب کو برابر یاد رکھا ہے کہ اسے کہانی کے ذریعے صرف ایک چیز یا ایک بات قاری کے ذہن تک پہنچانی اور اس کے دل میں اتارنی اور جاگزیں کرنی ہے افسانہ نگاری کے اسی بنیادی اصول نے یہ بات بھی سکھائی ہے کہ کہانی ختم ہونے کے بعد قاری کے ذہن پر ایک واحد تاثر قائم ہونا چاہیے۔

لیکن یہ واحد تاثر پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لیے اسے مختلف فنی وسیلے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ یہ فنی وسیلے اگر پوری ذمہ داری اور پورے فنی احساس اور خلوص کے ساتھ کام میں نہ لائے جائیں تو مجموعی تاثر کا حصول بھی ناممکن ہو جاتا ہے اور کہانی کی اس وحدت میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے جو اس کی بنیادی اور امتیازی خصوصیت ہے۔

افسانہ نگار یہ سوچ کر اور یہ فیصلہ کر لینے کے بعد کہ اسے اپنے افسانے کے ذریعے قاری کے ذہن پر کون سا واحد نقش قائم کرنا ہے۔ اپنے افسانے کا ایک ڈھانچہ بناتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ افسانہ کس طرح شروع ہوگا، کس طرح آہستہ آہستہ آگے بڑھے گا اور کس طرح ختم ہوگا۔

اچھی کہانی کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ لکھنے والے نے کہانی کے مختلف حصوں میں آہستہ آہستہ ایسی فضا بنائی ہو کہ پڑھنے والے کا ذہن اس مجموعی تاثر کو بڑے فطری انداز میں قبول کرے۔

فضا بنانے اور ذہن کو ایک خاص تاثر قبول کرنے پر آمادہ کرنے کا مشکل کام یوں تو پوری کہانی میں جاری رہتا ہے لیکن اس کا نقطۂ آغاز افسانے کے وہ ابتدائی الفاظ یا جملے ہیں۔ جنہیں ہم افسانہ کی تمہید کہتے ہیں۔

افسانہ کی تمہید افسانوی فن کی بڑی اہم، بڑی دشوار اور افسانہ نگار کے نقطۂ نظر سے بڑے کام کی منزل ہے۔

افسانہ نگار نے اپنے ہم سفر کی ابتدا اگر پوری طرح قدم جما کر ہمواری اور استواری کے ساتھ کی ہے تو آگے کا سفر اس کے لیے خود بخود آسان ہو جائے گا اور سب سے بڑی بات یہ ہوگی کہ اسے اپنے سفر کے بالکل شروع ہی سے ایسے ہم سفر مل جائیں گے جو قدم سے قدم ملا کر اس کے ساتھ چلیں گے۔ یہ ہم سفر وہ قاری ہیں۔ جو افسانہ کی موزوں تمہید سے متاثر ہو کر افسانہ کے آنے والے حصوں کو دلچسپی اور اشتیاق کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اچھے افسانہ نگار کبھی اپنے افسانے کی تمہید کی طرف سے غفلت نہیں برتتے۔ قاری کے ذہن پر پوری طرح چھا جانے کا جو نصب العین افسانہ نگار کے سامنے ہے وہ مناسب اور موزوں تمہید کے ذریعہ آدھا بلکہ بعض اوقات آدھے سے بھی زیادہ اس کے قبضے میں آ جاتا ہے۔

منٹو نے ایک دیانت دار اور مخلص فن کار کی طرح ہمیشہ اپنی جیت اسی

میں جاتی ہے کہ وہ موزوں تمہید سے شروع ہی سے قاری کے ذہن پر چھا جائے۔

منٹو نے اچھے اور بُرے جتنے بھی افسانے لکھے ہیں۔ ان کے موضوع اور خیال سے پڑھنے والا خواہ متفق ہو یا نہ ہو۔ لیکن افسانے کی تمہید میں اسے ضرور ایک دلکشی محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو افسانہ پڑھنے پر مجبور سا پاتا ہے۔

منٹو نے اپنے افسانوں کی تمہید سے مختلف موقعوں پر مختلف کام لیے ہیں۔ لیکن کام خواہ کچھ بھی لیا۔ قاری کے ذہن پر ابتدا ہی سے ایک گہرا نقش بٹھانے میں کامیابی ضرور حاصل کی ہے۔

منٹو کے چند افسانوں کی تمہیدیں دیکھ کر اندازہ لگایئے کہ تمہید کو پڑھنے والے کے لیے دل نشین بنانے کے علاوہ اس نے کن کن فنی مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔

"نیا قانون" اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

"منگو کوچوان اپنے اڈے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے دُنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش تھی کہ دُنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے اُستاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔"

اسی طرح "بلاؤز" کی تمہید یہ ہے:۔

"کچھ دنوں سے مومن بہت بے قرار تھا۔ اس کا وجود کچا پھوڑا سا بن گیا تھا۔ کام کرتے وقت، باتیں کرتے ہوئے حتیٰ کہ سوچنے پر بھی اسے ایک عجیب قسم کا درد محسوس ہوتا تھا۔ ایسا درد جس کو اگر وہ بیان بھی کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا۔"

ان دونوں تمہیدوں کے ذریعہ قاری کا تعارف دو کرداروں سے ہوتا ہے لیکن ایک ایسے انداز میں ہوتا ہے کہ اس کے دل میں ان دونوں کے متعلق کچھ اور جاننے کی خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اسے افسانہ کا باقی حصہ پڑھنے پر اکساتی اور مجبور کرتی ہے۔

دو تمہیدیں اور دیکھئے:۔

"گھر میں بہت چہل پہل تھی۔ تمام کمرے لڑکے، لڑکیوں، بچے بچیوں اور عورتوں سے بھرے تھے اور وہ شور برپا ہو رہا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اگر اس کمرے میں دو تین بچے اپنی ماؤں سے لپٹے دودھ پینے کے لیے بلبلا رہے ہیں تو دوسرے میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ڈھولکی لیے بے سری تانیں اُڑا رہی ہیں۔ نہ تال کی خبر ہے نہ لے کی، بس گائے جا رہی ہیں۔ نیچے ڈیوڑھی سے لے کر بالائی منزل تک مکان مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ کیوں نہ ہو، ایک مکان میں دو بیاہ رچے تھے۔ میرے دونوں بھائی اپنی چاند سی دُلہنیں بیاہ کر لائے تھے۔"

"میری اور اس کی ملاقات آج سے ٹھیک دو برس پہلے اپولو بندر پر ہوئی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ سورج کی آخری کرنیں سمندر کی ان دور دراز لہروں کے پیچھے غائب ہو چکی تھی، جو ساحل کے بنچ پر بیٹھ کر دیکھنے سے موٹے کپڑے کی لہریں معلوم ہوتی تھیں میں گیٹ آف انڈیا کے اس طرف پہلا بنچ چھوڑ کر جس پر ایک آدمی چمپی والے سے اپنے سر کی مالش کرا رہا تھا، جہاں سمندر اور آسمان گھل مل رہے تھے، بڑی بڑی لہریں آہستہ آہستہ اُٹھ رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت گہرے رنگ کا قالین ہے۔ جسے اِدھر سے اُدھر سمیٹا جا رہا ہے۔"

پہلی تمہید "شوشو" کی ہے اور دوسری "بانجھ کی"۔ دونوں تمہیدوں میں افسانہ نگار نے آنے والے واقعات کے لیے ایک فضا تیار کی ہے اور اس فضا میں دونوں موقعوں پر اتنے زیادہ رنگ بھرے ہیں کہ دیکھنے والا خود کو ان رنگوں کی کثرت میں ڈوبتا اور جذب ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے اور پھر یہ سوچ کر کہ دیکھیں اس کے بعد کیا ہوتا ہے افسانوں کو آگے بڑھاتا ہے۔

"پھاہا" کی تمہید صرف ایک جملہ ہے لیکن اس جملے سے افسانہ نگار نے اپنا کام ایک دوسری طرح نکالا ہے :-

"گوپال کی ران پر جب یہ پھوڑا نکلا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔"

گوپال کے متعلق افسانہ نگار نے اچانک جو خبر سنائی ہے اس سے قاری کے

اوسان بھی تھوڑے بہت ضرور خطا ہو جاتے ہیں اور وہ گھبرا کر اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ اس کے بعد کیا ہوا ہو گا۔ یہی افسانہ نگار کی جیت ہے اس نے ایک معمولی سی خبر سُنا کر قاری کو اپنے ساتھ یا اپنے پیچھے چلنے پر مجبور کر دیا۔

ایک اور افسانے کی تمہید دیکھیے :-

"ایک نہایت ہی تھرڈ کلاس ہوٹل میں دیسی وسکی کی بوتل ختم کرنے کے بعد طے ہوا کہ باہر گھوما جائے اور ایک ایسی عورت کی تلاش کی جائے جو ہوٹل اور وسکی کے پیدا کردہ تکدر کو دور کر سکے۔"

یہ تمہید "پہچان" کی ہے اس میں نہ کسی کردار کا تعارف ہے نہ کوئی فضا یا ماحول بنانے یا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، نہ کوئی چونکا دینے والی خبر سنائی گئی ہے، مگر بڑے واضح اشاروں میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ آگے کیا کچھ ہونے والا ہے اور اس طرح آنکھ کے اشارے سے قاری کو گویا یہ دعوت بھی دی گئی ہے کہ آؤ۔ اگر تم بھی ان شرابیوں کی سرگردانی دیکھنا چاہتے ہو تو آ جاؤ۔ اور معصوم قاری فوراً یہ دعوت قبول کر لیتا ہے۔

اور سنیئے :

"اسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اس کے کاندھوں پر دھر دی گئی ہیں۔"

"نعرہ" کی تمہید ہے اور اس میں افسانہ کے مرکزی کردار کیشو لال کی ذہنی کیفیت کا نقش قاری کے دل میں بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے اور ہر قاری شاید یہی ہے

گا کر افسانہ نگار اپنی کوشش میں کامیاب ہوا ہے۔ اس لئے کہ کیشو لال کے اس شدید احساس کے پیچھے کیا واقعہ کام کر رہا ہے، اس کے دل میں یہ جاننے کی خلش پیدا ہو گئی ہے اور اس طرح یوں سمجھئے کہ افسانہ نگار کا تیر نشانہ پر بیٹھا۔

"دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی، ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور گھر واپس گیا تھا وہ رات کو یہیں ٹھہر جاتا مگر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔"

یہ تمہید "ہتک" کی ہے اور اس میں افسانہ نگار نے ایک کے بجائے کئی باتیں کہی ہیں۔ ایک تیر سے کئی شکار کئے ہیں، اس لئے کہ افسانہ میں آگے چل کر جو گھمسان شروع ہونے والا ہے اس کا تقاضا ہی یہ ہے کہ وہ بات سیدھے سادے انداز میں کہنے کے بجائے ذرا تیکھے تیور کے ساتھ کہے۔ قاری افسانہ نگار کے ان تیکھے تیوروں کو پہچان جاتا ہے اور یہ سوچ کر کہ دیکھیں یہ تھک ہار کر سو جانے والی اور اپنی بیوی کا محبوب داروغہ صفائی آگے جا کر کیا گل کھلاتے ہیں، افسانہ کے منجدھار میں کود پڑتا ہے۔

منٹو نے افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنے منصب کو پوری طرح پہچانا اور اپنے ترکش کے ہر تیر کی اہمیت کا صحیح اندازہ لگایا ہے۔ ان ہی تیروں میں سے ایک تیر اس کے افسانہ کی تمہید ہے جو ہر افسانہ میں ایک نیا کام کرتی ہے، کردار کو متعارف کرنے کا، ایک

خاص فضا یا ماحول بنانے کا، ایک پھڑکتی ہوئی خبر سنانے کا، کسی کردار کی ذہنی کشمکش کی مصوری کرنے کا، آنے والے واقعات کے لیے زمین ہموار کرنے کا اور کبھی کبھی بہ یک وقت کئی ملے جلے مقصد پورے کرنے کا، لیکن ان گوناگوں کاموں کے علاوہ جو کام منٹو کے افسانہ کی ہر تمہید نے اپنے ذمہ لیا ہے یہ ہے کہ وہ قاری کے ذہن کو بیدار کر کے، اس کے دل میں گدگدی پیدا کر کے یا اس کے ذہن میں آگے بڑھنے کی خواہش پیدا کر کے افسانہ پڑھ لینے پر آمادہ کر دے۔

منٹو کی فنی کامیابی کی یہ بڑی اہم منزل ہے اور یہ منزل طے کرنے کے لیے اس نے عموماً پورے سوچ بچار سے قدم اٹھایا ہے۔

تمہید افسانہ کا پہلا قدم ہے اور اس کا انجام اس کی آخری منزل۔ افسانہ نگار اپنی تمہید کے ذریعے پڑھنے والے کے ذہن اور دل پر تسلط جماتا اور اسے افسانہ کے آنے والے حصوں میں دلچسپی کی طرف مائل کرتا ہے۔ آنے والے حصے سفر کی مختلف منزلیں ہیں۔ جن میں طرح طرح کی صعوبتیں مسافر کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ نہ جانے کیسے کانٹے ہیں جو اس کے تلووں میں چبھنے کے لیے بے قرار نظر آتے ہیں۔

افسانہ پڑھنے والا ان صعوبتوں کو آسان بنانے اور راستے میں پھیلے اور بکھرے ہوئے کانٹوں کو راستے سے ہٹانے کے لیے افسانہ نگار کی راہنمائی اور مدد کا طالب ہوتا ہے۔ بالآخر افسانہ نگار کی راہنمائی اسے منزلِ مقصود تک پہنچاتی ہے۔ جسے ہم افسانہ کا انجام کہتے ہیں۔ راہ کی ساری کٹھن منزلیں طے کرنے اور چبھنے والے کانٹوں کی خلش کو گوارا اور

آسان بنا لینے کے بعد اس کی سب سے بڑی خواہش اور تمنا یہ ہوتی ہے کہ اس کی منزل اس کے قلب و ذہن کے لیے سکون و راحت کا سرمایہ بہم پہنچا سکے۔ پڑھنے والے کے ذہن کو یہ سکون اور اس کے دل کو یہ راحت دینے کے لیے افسانہ نگار کو ایک ایسے انجام کی جستجو کرنی پڑتی ہے جو فنی حیثیت سے طے کی ہوئی منزلوں کا منطقی نتیجہ بھی معلوم ہو اور پڑھنے والے کے لیے قابلِ قبول بھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگار کو اپنے انجام کی تلاش میں پوری ذہنی کاوش کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

افسانہ کے خاتمہ پر افسانہ نگار کی ذرا سی سستی، ذرا سی تن آسانی، ذرا سی سہل انگاری اور بالکل معمولی سی غفلت اور تھکن اس کے افسانہ کا خون بھی کر سکتی ہے اور پڑھنے والے کے لیے کوفت اور خلش کا باعث بھی بن سکتی ہو۔

منٹو نے اپنے افسانوی فن میں انجام کی ان نزاکتوں کو پوری طرح محسوس کر کے عموماً اپنا فنی منصب پورا کرنے کی طرف توجہ دی ہے۔ اس نے اس "انجام" سے قاری کے ذہن کو متاثر کرنے کی خدمت بھی انجام دی ہے اور افسانہ کو افسانہ کی حیثیت سے مکمل کرنے کا کام بھی لیا ہے۔ منٹو کے بعض افسانوں کے انجام دیکھ کر اس کے فن کی خصوصیت کا اندازہ لگائیے۔

ان کا افسانہ "نیا قانون" اس طرح ختم ہوتا ہے:-

"اُستاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر وہ 'نیا قانون' نیا قانون چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سُنی۔

"نیا قانون" نیا قانون کیا بک رہے ہو۔ قانون وہی ہے پُرانا!" اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔"

"پھاہا" کا انجام یہ ہے:-

"نرملا بڑے انہماک سے پھاہا تراش رہی تھی۔ اس کی پتلی پتلی انگلیاں قینچی سے بڑا نفیس کام لے رہی تھیں۔ پھاہا کاٹنے کے بعد اس نے تھوڑا سا مرہم نکال کر اس پر پھیلایا اور گردن جھکا کر اپنے کُرتے کے بٹن کھولے۔ سینے کے داہنی طرف چھوٹا سا اُبھار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ٹکی پر صابن کا چھوٹا سا نامکمل بلبلا اٹکا ہوا ہے۔

نرملا نے پھاہے پر پھونک ماری اور اسے اُبھار پر جما دیا۔"

"فرشتین" کے آخری الفاظ یہ ہیں:-

"وہ دیر تک سوچتی رہی۔ وہ اب زیادہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا: "مجھے زندہ رہنا ہوگا۔"

اس کے اس دھیمے لہجے میں عزم کے آثار تھے۔ اس تھکی ہوئی جوانی کو اُونگھتی ہوئی چاندنی میں چھوڑ کر میں اپنے فلیٹ پر چلا آیا اور سو گیا۔"

"ہتک کی ہیروئن 'سوگندھی' ہم سے اس طرح رخصت ہوتی ہے:۔

بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔

"...... اس کے حلق سے ایک نعرہ ...... کان کے پردے پھاڑ دینے والا نعرہ، پگھلے ہوئے گرم گرم لاوے کے مانند نکلا ―― بہت تیری ......!

جتنے کبوتر ہوٹل کی منڈیروں پر اونگھ رہے تھے ڈر گئے اور پھڑپھڑانے لگے۔ نعرہ مار کر جب اس نے اپنے قدم زمین سے بڑی مشکل کے ساتھ علیحدہ کیے اور واپس مڑا تو اسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ ہوٹل کی عمارت اڑا اڑا دھم سے نیچے گر گئی ہے اور یہ نعرہ سن کر ایک شخص نے اپنی بیوی سے جو یہ شور سن کر ڈر گئی تھی، کہا: "پگلا ہے"۔"

(نعرہ)

"...... پہلے پہل تو میں بہت متحیر ہوا کہ یہ کس کی حرکت ہے مگر فوراً ہی

سب معاملہ صاف ہو گیا۔ سیواجی میری غیر حاضری میں اپنی ہمسایہ سلطنت پر نہایت کامیابی سے چھاپہ مار گئے تھے۔"

(میرا اور اس کا انتقام)

"اس واقعہ کو ایک زمانہ گزر چکا ہے مگر جب کبھی میں اس کو یاد کرتا ہوں، میرے ہونٹوں میں سوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں۔ یہ نامکمل بوسہ ہمیشہ میرے ہونٹوں پر انگارہ رہے گا۔"

(نامکمل تحریر)

"جب اس کو غسل دینے لگے تو ہسپتال کے ایک ڈاکٹر نے مجھے بلایا اور کہا "ڈاکٹر صاحب! اس کی مٹھی میں کچھ ہے۔" میں نے اس کی بند مٹھی کو کھول کر دیکھا۔ لوہے کے دو کلپ تھے۔ اس کی بیگو کی یادگار!
"ان کو نکال نہیں۔ یہ اس کے ساتھ ہی دفن ہوں گے۔" میں نے غسل دینے والوں سے کہا اور دل میں غم کی ایک عجیب و غریب کیفیت لئے دفتر چلا گیا۔"

(بیگو)

"وہ گھبرا کر اٹھا اور سامنے کی دیوار کے ساتھ اس نے اپنا ماتھا رگڑنا شروع کر دیا جیسے وہ اس سجدے کا نشان مٹانا چاہتا ہے۔ اس عمل سے اسے جب جسمانی تکلیف پہنچی تو پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ سر جھکا کر اور کاندھے ڈھیلے کر کے اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا "اے خدا! میرا سجدہ مجھے واپس دے دے۔۔۔۔"

(سجدہ)

منٹو کی مختلف کہانیوں کے یہ سب خاتمے جہاں ایک طرف اس مشترک خصوصیت کے حامل ہیں کہ ان سے پڑھنے والے کو اپنے ذہنی انتشار کے مجتمع کرنے میں مدد ملتی ہے اور وہ کہانی کے انجام میں سے اس اشتیاق کی تسکین تلاش کر لیتا ہے جو کہانی کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس میں پیدا ہوتا اور بڑھتا رہا تھا۔

دوسری طرف وہ ان میں سے ہر ایک خاتمہ کو اس منطقی ربط کی آخری کڑی بنا کر جو کہانی کی تمہید سے شروع ہو کر برابر زیادہ منظم بنتا رہا تھا۔ افسانہ کی فنی زنجیر کو مکمل کر لیتا ہے۔ ان میں سے ہر خاتمہ کی ایک نفسیاتی اور جذباتی حیثیت ہے اور دوسری فنی۔ منٹو نے جذبات، نفسیات اور فن کے رشتے جوڑنے اور انہیں مضبوط بنانے میں ہمیشہ اپنی کہانیوں کے انجام سے کوئی نہ کوئی کام لیا ہے۔

"نیا قانون" کے خاتمہ میں استاد منگو خاں کی اس جذباتی شدت کا ایسا متضاد رد عمل ہے جس سے پڑھنے والے کے دل میں درد کی ایک ٹیس اٹھتی ہے۔ "پھاہا" کا انجام واقعہ نگاری اور نفسیاتی تجزیہ کا بڑا سیدھا سادہ اور ایک ایسا غیر متوقع امتزاج ہے جو ایک معمولی سے واقعہ کو اس کی نظر میں بڑی اہمیت دے دیتا ہے۔

"شہ نشین پر" کا انجام جذباتی کھینچاؤ، کشمکش اور اس کے بڑے سادہ لیکن فنکارانہ حل کی تصویر ہے۔ "جنگ" کے انجام میں افسانے کے وسیع پس منظر، ایک خاص کردار کے شدید رد عمل اور زندگی کے ایک بڑے دکھتے ہوئے ناسور کو ایک معمولی سے واقعہ کے ذکر سے اس طرح حل کیا گیا ہے کہ تاثر کی شدت کم ہونے کے بجائے ایک مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے اور پڑھنے والا سوگندی کی جذباتی شدت میں اس کا ہمنوا ہو کر اس چیز سے نفرت کرنے لگتا ہے جو سوگندی کے نزدیک قابل نفرین ہے۔

"نعرہ" کے آخری چند جملوں میں کہانی کے مرکزی کردار کیشو لال کی جذباتی شدت اور اعصابی کشمکش کو تھوڑے سے لفظوں میں بیان کر کے افسانہ کو جس جملے پر ختم کیا ہے اس کی سادگی فضا کی شدت کو اور بھی نمایاں کر کے زندگی کی ٹریجڈی کو تلخ تر بنا دیتی ہے۔ جذباتی شدت اور فضا کی تی کو اس طرح کی سادگی سے نمایاں کرنا منٹو کے افسانوں کے خاتموں کی ایک واضح خصوصیت ہے۔

"بیگو" کا انجام منٹو کے فن کی ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ منٹو نے افسانہ کے خاتمہ پر ایک بظاہر بالکل غیر اہم اور معمولی بات کہہ کر پڑھنے والے

کے ذہن کو ایک بار پھر بڑی تیزی سے ان سارے واقعات میں گذار دیتے ہیں۔ جو افسانے میں اس سے پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ اس مرتبہ یہ معمولی سی غیر اہم بات گذرے ہوئے واقعات میں ایک ایسا رنگ بھر دیتی ہے جو اس سے پہلے پڑھنے والے کی نظر سے اوجھل رہا تھا۔

"میرا اور اس کا انتقام" میں آخری جملے میں چھپی ہوئی ہلکی سی ایمائیت کہانی کے دونوں مرکزی کرداروں کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کو آئینہ کی طرح روشن کر دیتی ہے۔ دونوں کرداروں نے کہانی میں شروع سے آخر تک جو کچھ کیا اور کہا ہے اس سے مختلف پڑھنے والے جو مختلف نتائج اخذ کرتے ہیں اس سیدھے سادے جملے سے ان میں مکمل ہم رنگی اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور ہر پڑھنے والا صرف ایک واضح اور صریح نتیجے کے سوا کسی دوسرے نتیجے پر نہیں پہنچتا۔

"نامکمل تحریر" میں آخری جملے میں بات کہنے کے ایک نئے انداز سے ایک معمولی سے رومانی واقعہ کو ایک ناقابل فراموش یاد کی حیثیت مل جاتی ہے۔

"سجدہ" کا انجام منٹو کی اس منفرد خصوصیت کی ترجمانی کرتا ہے جس میں افسانہ نگار کوئی ایسی بات کہہ کر جس سے پڑھنے والوں میں سے بعض کے تصورات پر ایک چوٹ سی لگتی ہے اپنے فن کے لیے زندگی کا سامان مہیا کرتا ہے۔

منٹو کی مختلف کہانیوں کے ان خاتموں پر نظر ڈال کر ان افسانوں کا فنی تجزیہ کرنے والا واضح طور پر یہ بات محسوس کرتا ہے کہ ان کے نقطۂ نظر سے سب خاتمے افسانے کے کلی

تاثر کو مکمل کرنے کی خدمت انجام دینے کے علاوہ پڑھنے والے کے ذہن کے لیے اس مسرت کا باعث بنتے ہیں جو ہر اچھی فنی تخلیق کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔

ان سب خاتموں میں لکھنے والے کی قدرتِ بیان اور اس کے انداز فکر کی ندرت اور شوخی ہر جگہ ایک نیا رنگ پیدا کرتی ہے۔ کبھی محض سادگی بیان سے، کبھی تضادات سے کبھی تکرار سے، کبھی مزاج کی شوخی سے، کبھی طنز سے اور کبھی مشاہدہ، فکر اور تخیل کے امتزاج سے وہ اپنے فن کی تکمیل میں مدد لیتا ہے اور پڑھنے والا اگر غور سے دیکھے تو یہ محسوس کرنے میں دقت نہیں ہوتی کہ افسانہ کے خاتمہ کا یہ انداز پوری طرح سوچا سمجھا ہوا ہے۔

افسانہ نگار کے خاتمہ کے وہ چند جملے جن میں ہر جگہ اس کی ذہانت، فطانت، اور شوخی نمایاں ہے محض اتفاق کا نتیجہ نہیں۔

افسانہ اُتار چڑھاؤ کے مختلف مرحلے طے کر کے یہاں تک پہنچا ہے۔ بلکہ شاید یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ افسانہ نگار نے اسے اس منزل تک پہنچایا ہے اور اس طرح پہنچایا ہے کہ تھکن کا شائبہ کبھی پیدا نہیں ہونے پایا۔

افسانہ کے انجام میں وہی تازگی و توانائی یہاں بھی ہے جو اس کے آغاز میں تھی اور یہ نتیجہ ہے۔ افسانہ نگار کی اس فنی توانائی کا جو ہر مرحلہ پر اور ہر منزل میں اس کی ہم عناں اور ہم سفر ہے۔

افسانہ کا آغاز اور اس کا انجام۔ ان دونوں مرحلوں کے درمیان افسانہ نگار کو جن مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے وہ اگر ان میں سے کسی ایک کی اہمیت کی طرف سے بھی

غفلت یا بے نیازی برتے تو افسانہ کے مجموعی تاثر میں فرق پیدا ہو جانا ضروری ہے۔ منٹو کو فن کے ان مراحل کا پورا احساس ہے اس لئے ان کا ہر افسانہ آغاز سے انجام تک بعض واضح مرحلے طے کرتا ہے اور اس طرح ہر انجام میں ایک ایسی منطق ہوتی ہے۔ جس کا پڑھنے والے کو احساس تو نہیں ہوتا لیکن اس سے وہ متاثر اور مسرور ضرور ہوتا ہے۔

افسانہ شروع ہو کر دھیمی لیکن تلی تلی چال سے، بڑے نرم لیکن بڑے توانا قدم رکھتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور جوں جوں آگے بڑھتا ہے، پڑھنے والے کے دل و دماغ پر اس کا قبضہ زیادہ مستحکم اور زیادہ یقینی ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس دھیمی اور تلی تلی رفتار سے افسانہ اپنے انجام کو پہنچتا ہے اور افسانہ کے ہر مرحلہ پر اس کا ساتھ دینے والا قاری سفر کے اختتام پر ایک طرح کا سکون، ایک طرح کی مسرت محسوس کرتا ہے۔ اسے یوں لگتا ہے اس نے کوئی بہت بڑا مرحلہ طے کیا ہے اور بڑی کامیابی سے طے کیا ہے۔

یہ احساس ہی حقیقت میں افسانہ نگار کی فنی کامیابی کی دلیل ہے۔ ایک ایسی کامیابی جو یوں ہی اتفاقاً ہاتھ نہیں آجاتی۔ اس میں لکھنے والے کو پورے سوچ بچار سے کام لینا پڑتا ہے۔ آغاز اور انجام کے درمیان کی ہر چھوٹی بڑی کڑی کو بڑی احتیاط سے اسی جگہ جوڑنا پڑتا ہے جو اس کے لیے زیادہ موزوں ہو۔ کوئی کڑی ذرا بھی جگہ سے بے جگہ ہو جائے تو ساری زنجیر درہم برہم ہو جائے۔ اس کے ابتدائی سرے اور آخری سرے میں جو ہموار ربط ہے اس میں جھٹکے پڑ جائیں اور پڑھنے والے کو اس ربط میں ایک خوشگوار جھنکار کا جو تصور پوشیدہ ہے وہ ریزہ ریزہ ہو جائے۔

ہمارے کم افسانہ نگاروں نے کڑیوں کے ربط کی اس جھنکار کے احساس کو اہمیت دی ہے اور جنہوں نے دی ہے انہوں نے ہمیشہ اس کے فنی مطالبات کا پابند رہنا ضروری نہیں سمجھا۔

منٹو کے فن کا یہ نادر امتیاز ہے کہ اس نے آغاز اور انجام کو ایک زنجیر میں منسلک کرنے کی اہمیت کبھی نہ بھلاتے ہوئے ہمیشہ ہر افسانے کی ضرورت کے مطابق اس کے درمیانی حصوں کی ساخت، ترتیب، رفتار اور اتار چڑھاؤ کو پوری فنی ذمہ داری کے ساتھ برتا ہے۔

منٹو کے نزدیک فن کے ان مراحل کی جو اہمیت ہے اس کا اندازہ منٹو کے بعض افسانوں پر نظر ڈال کر کیجئے۔

"نیا قانون" کے استاد منگو خاں کے جذبات کی پہلی منزل تو وہ ہے جب وہ ہندوستان میں نافذ ہونے والے جدید آئین کی خبر سن کر خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور اس کا انجام یہ ہے کہ نیا قانون نافذ ہو جانے کے بعد بھی اسے ایک گورے سے لڑنے کے جرم میں حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔

اس آغاز اور انجام کے درمیانی حصوں کو کس طرح پُر کرنا کہ افسانے کا انجام پڑھنے والے کے لیے بھرپور کرب انگیز بن جائے۔ منٹو کے فنی احساس کی پیدا کی ہوئی ترتیب و تنظیم کا مظہر ہے۔

یہی صورت "کالی شلوار" کے ساتھ ہے۔ کالی شلوار میں طوائف کی زندگی اور اس کے گھناؤنے ماحول سے تعلق رکھنے والی بہت سی چیزیں پڑھنے والے کے سامنے آتی ہیں۔ اسی ماحول میں واقعات میں ایسا اُتار چڑھاؤ پیدا ہوتا ہے اور وہ ایسے پیچ در پیچ مراحل سے گذرتے ہیں کہ پڑھنے والا ماحول کے گھناؤنے پن کی طرف متوجہ ہوئے۔ بغیر صرف ان نفسیاتی محرکات میں دلچسپی لیتا ہے جو کرداروں کو ایک خاص طرح کے عمل کی طرف مائل کرتے ہیں۔

"کالی شلوار" طوائفوں کی گندی کہانی ہونے کے باوجود پڑھنے والے کو اس لئے متاثر کرتی ہے کہ اس میں اس ماحول کے دو کرداروں کی ذہنی کیفیتوں کا ایسا تجزیہ ہے جس میں کہانی کی ساری دلکشی ہے۔

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ افسانہ نگار نے شروع سے آخر تک افسانے میں جتنی چھوٹی بڑی باتوں کو ایک زنجیر میں مربوط کیا ہے ان میں ایک ایسا رشتہ پیدا ہو گیا ہے جو کسی سخت سے سخت حادثہ سے بھی نہیں ٹوٹ سکتا۔

کہانی کے مختلف ٹکڑوں میں یہ کبھی نہ ٹوٹنے والا رشتہ قائم کرنا، اس کے آغاز اور انجام کو اس طرح چھوٹی بڑی بہت سی اہم اور غیر اہم باتوں کے ذریعہ آپس میں جوڑنا کہ دونوں آپس میں لازم و ملزوم معلوم ہونے لگیں۔ اور دونوں منطقی طور پر یوں شیر و شکر ہو جائیں کہ ایک دوسرے کا سبب اور نتیجہ بن جائیں۔

منٹو کے فن کی ایسی خصوصیت ہے جو ان کے افسانے میں (یا کم از کم اکثر افسانوں میں) موجود نظر آئے گی۔ منٹو نے اپنی اسی خصوصیت کے ذریعے بہت سے پڑھنے والوں کو اپنا گرویدہ بنایا ہے۔

---

(۲)

منٹو کے افسانوی فن کا ایک پہلو تو وہ ہے جس کا ذکر میں اب تک کرتا رہا ہوں اور جس میں افسانہ کی مصنوعی ساخت، ترتیب، تشکیل اور تعمیر جیسی چیزیں شامل ہیں۔ افسانہ کی تمہید، اس کی اُٹھان، اس کے واقعات کا اتار چڑھاؤ، پیچ اور الجھاؤ کے بعد افسانہ کا نقطۂ عروج اور اس کا خاتمہ ان سب چیزوں کا تعلق افسانے کے ڈھانچے اور اس کی ساخت سے ہے اور اس ساخت میں افسانہ کی ظاہری ہیئت اور اس ہیئت کا مجموعی تاثر پڑھنے والے کے لیے وہ سب سے اہم چیزیں ہیں۔

منٹو نے افسانوی فن کے اس ظاہری اور خارجی پہلو کو اور اس کے مختلف اجزا اور عناصر کو جو اہمیت دی ہے اس سے ہمیں یہ اندازہ لگانے اور یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی کہ منٹو ایک فن کار کی حیثیت سے فن کے ان ظاہری پہلوؤں کو اپنے افسانے کی ساخت اور تشکیل میں ایک بنیادی اور اہم حیثیت دیتے ہیں اور ان کی اہمیت ان کے نزدیک اس لئے ہے کہ یہ پڑھنے والے کے ذہن اور قلب پر ایک مخصوص تاثر قائم کرنے کے یقینی وسائل

ہیں گویا فن کار کا مقصود بالذات فن کے یہ ظاہری پہلو ہرگز نہیں وہ تو ان ظاہری پہلوؤں سے ایک اہم وسیلہ کا کام لے کر تاثر پیدا کرنے کا وہ مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے جو ہر اچھے فن کی مشترک خصوصیت ہے۔

اس لئے منٹو کے فن کا تجزیہ کرنے کی یا ابتدائی منزل طے کر لینے کے بعد ہمیں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ منٹو نے اپنے افسانوں میں تاثر انگیزی کی خصوصیت کو فن کی بنیاد بنا کر اس کے حصول کے لیے ان خارجی اور تکنیکی چیزوں کے علاوہ اور ایسے کون کون سے طریقے برتے اور استعمال کئے ہیں جنہیں ہم اس کے اسلوب نگارش کی خصوصیت کہہ سکیں۔

یہ صحیح ہے کہ کسی افسانے کے مجموعی تاثر کو ایک خاص رنگ دینے میں فن کے ان ظاہری پہلوؤں کا بھی ایک خاص مقام ہے جن کا ذکر اب تک ہوتا رہا ہے۔ لیکن ان سے بھی خاص حیثیت اظہار اور ابلاغ کے ان طریقوں کو حاصل ہے۔

جنہیں ہر مصنف اپنی اپنی پسند، اپنی اپنی صلاحیت اور مذاق کے مطابق برتتا ہے۔ ایک سیدھی سادھی یا پیچیدہ سے پیچیدہ بات کہنے کا انداز کیا ہو، اس کے لیے کسی خاص محل پر سیدھے سادھے فقرے، اشارے، کنایئے، تشبیہ، استعارے، تضاد یا تکرار میں سے کون سا حربہ زیادہ مؤثر ثابت ہوگا یہ بات ہر مصنف اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق سوچتا اور ان صلاحیتوں کے مطابق ان میں سے جس حربہ یا وسیلہ کو جس خاص محل کے لیے موزوں اور مؤثر سمجھتا ہے استعمال کرتا ہے۔

لفظوں، فقروں، اشاروں، کنایوں، تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال کا یہی مخصوص اور منفرد انداز ایک مصنف اور دوسرے مصنف کے اسلوب میں فرق پیدا کرتا ہے۔

منٹو کے افسانوی فن کو اگر اسلوب اور اظہار کے ان وسائل کے نقطۂ نظر سے پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کی جائے تو سب سے پہلی چیز جو پڑھنے والے کو شدت کے ساتھ متاثر کرتی ہے یہ ہے کہ منٹو کے پاس معمولی سے معمولی بات کے اظہار کے لیے ایک غیر معمولی انداز موجود ہے۔

فقرہ کی ساخت میں معمولی سی تبدیلی لفظوں کے برتنے میں تھوڑی سی جدت پسندی اور بہت اہم اور بڑی گہری بات کو اس طرح ادا کر دینے کہ جیسے وہ بات نہ اہم ہو نہ عمیق منٹو کے انداز اظہار کے بعض واضح پہلو ہیں۔

بعض ٹکڑے دیکھ کر ان کے اسلوب کی ان خصوصیتوں کو پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کیجئے۔

۱ - سب سے پہلی مثال "نیا قانون" کی ہے۔ استاد منگو نئے قانون کی خبر سن کر آیا ہے اور یہ خبر کسی دوسرے تک پہنچانے کے لئے بے قرار ہے راستے میں نتھو گنجا اڈے پر آتا ہے، منگو بلند آواز میں اس سے کہتا ہے۔

"ہاتھ لا ادھر۔ ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے۔ تیری اس گنجی کھوپری پر بال اگ آئیں"

۱ - "ہتک" میں بازار حسن کی عورتوں کے متعلق کہا گیا ہے ——— "یہ رنگ برنگی عورتیں مکانوں میں پکے ہوئے پھلوں کے مانند لٹکی رہتی ہیں ——— آپ

پیچھے سے ڈھیلے اور پتھر مار کر انہیں گرا سکتے ہیں ؟

٣ ۔ "پہچان" ہی میں ایک لڑکی کا ذکر یوں آیا ہے "مروڑیاں اسی کے ہاتھوں سے پکے فرش پر گر رہی تھیں اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نانج رو رہا ہے اور یہ مروڑیاں اس کے آنسو ہیں ؟

٤ ۔ "پہچان" میں ایک اور بازاری عورت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔ " وہ اس انداز سے اپنا ہاتھ ہلا رہی تھی جیسے مکار دوکاندار کی طرح ڈنڈی مارے گی اور کبھی پورا تول نہیں تولے گی ؟

٥ ۔ "شوشو" میں ایک جگہ کہا گیا ہے ــــ "شوشو ــــ شوشو ــــ ارے یہ کیا ؟ دو تین بار اس کا نام میری زبان پر آیا تو میں نے یوں محسوس کیا کہ پیپر منٹ کی گولیاں چوس رہا ہوں ؟

٦ ۔ "شوشو" ہی میں سونے سے پہلے کی کیفیت یوں بیان ہوئی ہے ــــ "میری پلکیں آپس میں ملنے لگیں ۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں دھنکی ہوئی روئی کے بہت بڑے انبار میں دھنسا جا رہا ہوں ؟

٧ ۔ "خوشیا" میں ــــ "کانتا کا ننگا جسم موم کے پتلے کے مانند اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا اور پگھل پگھل کر اس کے اندر جا رہا تھا ؟

٨ ۔ "آپ کو ایسے آدمی نظر آئیں گے جو محبت کرنے کے معاملے میں بانجھ ہیں" (بانجھ)

٩ ۔ "ــــ محبت کا اسقاط بھی ہو سکتا ہے" (بانجھ)

١٠ ۔ اندر ہی اندر اس نے اپنے ہر ذرّے کو بم بنا لیا تھا کہ وقت پر کام آئے ۔" (نفرت)

١١ ۔ "جب نیکلو نے سینے کی ہوا خارج کی تو مومن کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے اندر ربڑ کے کئی غبارے پھٹ گئے ہیں ۔" (بلاؤز)

١٢ ۔ "نفو کے دل پر ایک گھونسہ سا لگا ۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ دوپہر کی دھوپ میں اڑنے والی ساری چیلیں اس کے دماغ میں گھس کر چیخنے لگی ہیں (اس کا پتی)

١٣ ۔ "کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا کہ ہوا میں بہت اونچی لٹکی ہوئی ہو ۔ اوپر ہوا نیچے ہوا ، دائیں ہوا ، بائیں ہوا ۔ بس ہوا ہی ہوا ہے اور پھر اس ہوا میں دم گھٹنا بھی ایک خاص مزا دیتا ہے ؟ (ہتک)

١٤ ۔ "فضا میں نیندیں گھلی ہوئی تھیں ، ایسی نیندیں جن میں بیداری زیادہ ہوتی ہے اور انسان کے ارد گرد نرم نرم خواب یوں لپٹ جاتے ہیں جیسے اونی کپڑے ؟ (دھواں)

١٥ ۔ "میں نے انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرنا شروع کر دی ۔ میں یہ محسوس کرنے لگا کہ اس کے بال میرے الجھے ہوئے خیال ہیں جن کو میں اپنے ذہن کی انگلیوں سے ٹٹول رہا ہوں ؟

١٦ ۔ "اسے صرف اپنے آپ سے غرض تھی اور بس ۔ دوسروں کی جنت پر وہ ہمیشہ اپنی دوزخ کو ترجیح دیتا تھا ؟ (نیا سال)

١٧ ۔ "محبت ایک عام چیز ہے ۔ حضرت آدم سے لے کر ماسٹر خادم تک سب محبت

کرتے ہیں (تبغض)

۱۸ - "زندگی کیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک ادنیٰ جراب ہے جس کے دھاگے کا ایک سرا ہمارے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ ہم اس جراب کو ادھیڑتے رہتے ہیں جب ادھیڑتے ادھیڑتے دھاگے کا دوسرا سرا ہمارے ہاتھ میں آجائے گا تو یہ طلسم جسے زندگی کہا جاتا ہے ٹوٹ جائے گا" (مصری کی ڈلی)

منٹو کے افسانوں کے یہ متفرق اقتباسات اس کے انداز بیان کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہیں۔ مثال نمبر ۱ میں منگو نے جب یہ بات کہی کہ ایسی خبر سنا کر جی خوش ہو جائے تو یہ معمولی سی بات تھی لیکن یہ بظاہر معمولی ہونے والی بات منگو کے نزدیک بہت اہم تھی۔ منٹو نے منگو کے مزاج، اس کی ذہنی سطح اور گنجے نتھو کی مختلف خصوصیتوں کو جمع کر کے ایک ایسا جملہ لکھا جو منگو کی ذہنی کیفیت کی پوری ترجمانی کرتا ہے۔ منگو کی جذباتی شدت کے اظہار کے لئے منٹو نے جو جملہ واضح کیا ہے وہ منٹو کا منفرد رنگ ہے۔ ایک چلتے ہوئے غیر سنجیدہ فقرے کو ایک بے حد اہم اور گہرے مفہوم کا حامل اور ترجمان بنانا منٹو کے جدت پسند اسلوب کی ایک خصوصیت ہے۔

مثال نمبر ۲ میں پڑھنے والے کے سامنے جو تشبیہ آتی ہے اسے دیکھ کر پڑھنے والے کو اس کے نئے پن کا احساس تو ضرور ہوتا ہے لیکن وہ سوچتا ہے کہ اس تشبیہ میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں ہے کہ منٹو کے سوا کسی اور کا ذہن اس تک نہ پہنچ سکتا

لیکن منٹو یہ کہتے ہیں کہ "تم آپ نیچے سے ڈھیلے اور پتھر مار کر انہیں گرا سکتے ہیں" تو پوری تشبیہ پر منٹو کے منفرد اور امتیازی اسلوب کا رنگ چھا جاتا ہے اس لئے کہ یہ جملہ جو خیال یا زبان کے اعتبار سے بالکل معمولی سا اور چلتا ہوا ہے بازاری عورت کے کردار اور اس کی ان خصوصیات کو پوری طرح بے نقاب کر دیتا ہے جو اس جماعت کی عورتوں کی زندگی کا امتیاز سمجھی جاتی ہیں۔

تیسری مثال میں ابتدائی ٹکڑے میں مشاہدہ کی جو باریک بینی ہے وہ خود اپنی جگہ منٹو کے طرز فکر کی ایک خصوصیت ہے لیکن جس عورت کے ہاتھ سے وہ مروڑیاں نیچے گر رہی تھیں اس کے لئے منٹو کے دل میں گھن بھی ہے اور نفرت بھی۔ اس گھن اور نفرت کا اظہار کرنے کے لئے اکثر لکھنے والوں کو بحر فکر میں غوطہ زنی کر کے نہ جانے کیسے کیسے گوہر آبدار نکالنے کی فکر ہوتی ہے۔ لیکن منٹو کے پاس شدید سے شدید جذبے کے اظہار کے لئے آسان سے آسان لفظ موجود ہیں اور ان لفظوں کو ایک ایسی ترتیب دے کر جملے کی ظاہری حیثیت تو سادہ و حقیر ہو جائے لیکن اس کی معنویت کئی گنا زیادہ ہو جائے۔ منٹو کی قدرت بیان کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ ادنیٰ اس لئے کہ یہ کرشمہ کبھی کبھی نہیں ہمیشہ ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے

یہی صورت مثال نمبر ۴ کی ہے۔ جہاں منٹو نے اسی طرح کی ایک اور عورت کا ذکر کیا ہے جو ان کے نزدیک قابل نفرین ہے۔ اگر ایسے لفظوں کے ذریعے ظاہر کی جائے جو بیشتر ہی طور پر جذبۂ نفرت کے مظہر ہوں تو بیان میں عمومیت آ جائے۔ منٹو نے اپنے

انداز کو ہمیشہ عمومیت سے بچایا اور سادگیٔ بیان کو گہری معنویت کا ترجمان بنایا ہے۔

مثال نمبر پانچ تاثر انگیزی کی خصوصیت کے لحاظ سے اوپر کی دونوں مثالوں سے ملتی جلتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں پیپرمنٹ کی ایک سادہ سی مثال نے پڑھنے والے کے لئے بھی شوشو کے نام میں وہی لذت پیدا کر دی ہے جس سے افسانہ نگار کا دل پوری طرح آشنا ہے۔

چھٹی اور ساتویں مثال منٹو کے انداز بیان کی ندرت اور قدرت کلام کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ منٹو انسانی ذہن کے شدید سے شدید تاثر اور اس کے دل کے نازک سے نازک اور لطیف سے لطیف جذبہ کا بیان ایسے لفظوں میں کر دیتے ہیں کہ وہ شدید تاثر اور نازک اور لطیف جذبہ مجسم ہو کر پڑھنے والے کے سامنے جاتا ہے۔ ایک غیر مرئی اور غیر مادی حس ایک ٹھوس اور مرئی حقیقت بن کر نظر کے سامنے آتی ہے۔

آٹھویں اور نویں مثالوں میں منٹو نے دو نئے تصورات پیش کئے ہیں۔ بانجھ اور اسقاط کا ایک واضح لغوی مفہوم ہمارے ذہن میں موجود ہے۔ اس لئے منٹو جب محبت کے لئے یہ کہتے ہیں کہ وہ بانجھ ہو سکتی ہے۔ اس کا اسقاط ہو سکتا ہے تو ہمارا ذہن اس کا جو فوری تاثر قبول کرتا ہے اس میں الجھن اور تکدر کی ایک ملی جلی کیفیت ہوتی ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ جب وہ نئے سیاق و سباق میں ان لفظوں کے مفہوم پر غور کرنا شروع کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ منٹو نے ایک گہرے فلسفیانہ خیال کے

اظہار کے لئے دو ایسے لفظوں کا انتخاب کیا ہے جو کسی طرح بھی اس فلسفہ اور بوجھ اٹھانے کے اہل نہیں تھے۔ لیکن منٹو کی چابکدستی کی بدولت ان دونوں معمولی اور حقیر لفظوں کی حیثیت بالکل بدل گئی۔ انہوں نے نہ صرف ایک ایسی حقیقت کا اظہار بڑی کامیابی سے کر دیا جس کے وہ اپنی ذاتی حیثیت سے وہ اہل نہیں تھے بلکہ پڑھنے والوں کے لئے سوچ بچار کے دروازے بھی کھول دیئے۔ منٹو کے اسلوب کی جدت پسندی نے بعض اوقات چھوٹے لفظوں سے بڑا کام لیا ہے اور اس طرح معمولی لفظوں میں وقتی طور پر ایک گہرائی اور گیرائی پیدا ہو گئی ہے۔ یہی صورت ان دونوں مثالوں میں ہے۔

دسویں سے لیکر پندرھویں مثال تک ہر جملہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ منٹو کے طرز اور اسلوب نگارش کی اس خصوصیت کا حامل ہے کہ وہ کسی کردار کی ذہنی کیفیت کی ساری شدتوں اور گہرائیوں کو کبھی بالکل سادہ جملوں سے، کبھی ایسی تشبیہوں اور مثالوں سے جو دوسرے لکھنے والے کو یقیناً اس موقع پر بے محل معلوم ہوئیں۔ جہاں منٹو نے انہیں کامیابی سے برتا ہے اور کبھی بہت سی ملی جلی واضح تصویروں سے اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا کسی طرح کی حیرت کے بغیر اس جذباتی شدت اور گہرائی کا مکمل تاثر قبول کر لیتا ہے۔ دل کی بات ایک زندہ اور مرئی حقیقت بنکر اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے اور بالاعلان کہتی ہے کہ دیکھو یہ میں ہوں مجھے اچھی طرح پہچان لو اور دیکھنے والا ایک ہی نظر میں اس زندہ حقیقت کو اس طرح پہچان لیتا ہے کہ وہ اس کے لئے ناقابل فراموش بن جاتی ہے۔

سولھویں مثال میں منٹو کے اسلوب کی یہ خصوصیت نمایاں ہے کہ کسی واقعہ یا کردار کے سلسلہ میں قاری کو کوئی خبر سنا کر فوراً ایک دوسرے جملے سے اس خبر کی وضاحت کرتے ہیں اور اس وضاحت کے بعد واقعہ کا وہ پہلو یا کردار کی وہ مخصوص کیفیت جس کا بیان مقصود ہے۔ آئینہ کی طرح روشن اور سورج کی طرح تاباں ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

سترھویں مثال بھی اسی طرح کی وضاحت کی ایک دوسری شکل ہے یہاں افسانہ نگار نے بھی ایک خبر یہ کہہ کر سنائی کہ ہجرت ایک عام چیز ہے اور اس خبر کی وضاحت کے لئے جو مثال پیش کی وہ بظاہر مذاق اور طنز کی ایک معلوم ہونے کے باوجود اس قدر منطقی ہے کہ سننے والا اسے جھٹلانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ منٹو کے فلسفہ کی طرح ان کی منطق بھی غیر معمولی سہاروں کی محتاج نہیں۔ یہاں بھی سادگیٔ بیان اور اہم ترین بات کو حد درجہ معمولی سمجھ کر اس کی اہمیت بڑھانے کی خصوصیت برابر کار فرما ہوتی ہے۔

آخری مثال میں بھی منٹو کے فکر اور اسلوب کی اسی خصوصیت کی آمیزش اور امتزاج ہے۔ جہاں گہرے خیال اور سیدھی سادی عبارت اور معمولی سی تشبیہہ کو اس طرح ایک ہی زنجیر کی کڑیاں بنایا جاتا ہے کہ پڑھنے والا سوچنے لگتا ہے کہ گہری باتیں اور فلسفیانہ حقیقتیں واضح کرنے کا بہترین اور مؤثر ترین انداز وہ ہے جسے منٹو نے اپنایا ہے۔

منٹو نے اپنے افسانوں میں سیدھے سادے روزمرہ کی بول چال کے جملوں سے ایسی مثالوں اور تشبیہوں سے جو دوسروں کی نظر میں بالکل حقیر اور بے حقیقت ہیں اور ایسے چلتے ہوئے فقروں میں سے جن میں سنجیدگی و متانت کا شائبہ تک نہیں ہوتا گہری سے گہری، سنجیدہ سے سنجیدہ اور مؤثر سے مؤثر بات کہنے کا کام لیا ہے اور ہر جگہ اس سادگی اور عمومیت کو تصور آفرین، فکر انگیز اور خیال افروز بنایا ہے۔ پھر بھی بہت کم مقامات ایسے ہیں جنہیں پڑھ کر قاری کے دل میں یہ بات آتی ہو کہ دوسروں کے فکر اور تخیل کی شمع جلانے والے منٹو نے یہ باتیں کہنے کے لئے اپنے ذہن پر زور دیا ہے۔ منٹو نے جو کچھ کہا ہے اس میں آورد نام کو نہیں ایک ایسی آمد ہے جو شخصیت کے زور اور اس کے بے لاگ خلوص کی مظہر ہے۔ منٹو کے پورے اسلوب پر یہی بے تکلفی اور بے ساختگی چھائی ہوئی ہے۔ اس کا پرتو ہمیں منٹو کی ان تشبیہوں میں بھی نظر آتا ہے جو اس کے ترکش فن کے بڑے صید افگن تیر ہیں۔

ایسے تیروں کی منٹو کے ترکش میں کوئی کمی نہیں۔ بے شمار تشبیہوں میں سے چند پر نظر ڈال کر اندازہ لگایئے کہ منٹو کا ہمہ رنگ اور ہمہ صفت فن ان تشبیہوں میں سے کب کب اور کس کس طرح کام لیتا ہے۔

استاد منگو نے فوجی گوروں کے چہرے کا جو تصور پیش کیا ہے وہ کس قدر مکروہ اور گھناؤنا ہے:۔

" ان کے لال جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی

ہے۔ جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو۔"

(نیا قانون)

منٹو کے دل میں (یا منٹو کے کسی کردار کے دل میں) کسی چیز، کسی واقعہ یا شخص کا جو تصور ہے اسے دوسرے کے ذہن تک، جوں کا توں پوری طرح منتقل کرنے کے لیے منٹو کے پاس الفاظ، فقروں اور جملوں کی کمی نہیں۔

اسی طرح ان کا ذہن تازہ مشکل سے مشکل ذہنی اور جذباتی تجربہ کو اس کی مکمل نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ دوسروں تک پہنچانے کے لیے ایسی تشبیہیں وضع کر لینے پر قادر ہے جن کی طرف کسی اور کا ذہن منتقل بھی نہیں ہوتا۔ یہی خصوصیت اوپر کی مثال میں ہے۔

منٹو جس طرح الفاظ اور جملوں کے ذریعہ محبت، نفرت، حقارت، رشک، حسد، خلوص، صداقت اور رحم و کرم کے احساسات میں قاری کو پوری طرح اپنا ہمنوا بنا سکتے ہیں اسی طرح تشبیہوں کی مدد سے اور اکثر بالکل معمولی معمولی تشبیہوں سے وہ ہر طرح کے احساس اور جذبہ کو اس طرح جیتا جاگتا بنا کر پڑھنے والے کے ذہن میں اُتار دیتے ہیں کہ وہ جذباتی طور پر اپنے آپ کو افسانہ نگار کے سپرد کر دیتا ہے۔

اُستاد منگو کی زبان سے مارواڑیوں کو غریبوں کی کٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل کہلوانے اور اس بات کو اس طرح مکمل کرنے میں کہ "نیا قانون ان کے لیے کھولتا ہوا پانی ہوگا" منٹو کے فن کی یہ خصوصیت نمایاں ہے۔

جب اُستاد منگو کی نگاہیں گورے کی آنکھوں سے چار ہوئیں تو ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں کی گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اوپر کو اڑ گئیں۔ بندوقوں سے نکلی ہوئی گولیوں کی تشبیہ میں کوئی نئی بات نہیں لیکن اس کے برمحل صرف نے ایک شدید احساس کو ایک واضح اور مڑی ہوئی شکل دے دی ہے۔

ایسی تشبیہیں جن میں یوں بظاہر کوئی نیا پن نہ ہو دوسروں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتیں لیکن منٹو کا دوررس تصور ہمیشہ دو چیزوں میں موزوں ترین مشابہت تلاش کر کے اسے بڑی برجستگی سے صرف کرتا ہے اور ایک معمولی اور بظاہر بے حقیقت سی تشبیہ ایک مکمل مفہوم کی حامل اور ایک گہرے تجربہ کی عکاس بن جاتی ہے۔

بندوقوں سے نکلی ہوئی گولیوں جیسی اور بہت سی سیدھی سادی لیکن اپنے تاثر کے لحاظ سے اہم تشبیہیں منٹو کے ہر افسانہ میں قدم قدم پر ملتی ہیں۔

ایسی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے:۔

"وہ بڑی خوفناک عورت تھی۔ اس کا منہ کچھ اس انداز سے کھلتا تھا جیسے لیموں نچوڑنے والی مشین کا کھلتا ہے۔"

(پہچان)

"اس کی آنکھیں مست تھیں اور ہونٹ تلوار کے تازہ زخم کے مانند کھلے ہوئے تھے۔"

(خوشبو)

خوشیا کے مردانہ وقار کو اس بات سے سخت دھکا لگا ہے کہ کانتا برہنہ اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی اور اپنی اس حرکت کا جواز اس نے یہ کہہ کر پیش کیا کہ "کیا حرج ہے اپنا خوشیا ہی تو ہے۔" یہ بات خوشیا کے دماغ میں طرح طرح کے روپ بھر کر اسے ستاتی اور پریشان کرتی ہے۔ ان بے شمار روپوں میں سے ایک یہ ہے:۔

"خوشیا نہ ہوا سالا وہ بلا ہو گیا جو اس کے بستر پر ہر وقت اونگھتا رہتا ہے۔"

(خوشیا)

"بانجھ" میں ایک منظر کا تصور منٹو نے اس طرح پیش کیا ہے:۔

"کبھی کبھی کسی آنے یا جانے والی موٹر کے ہارن کی آواز بلند ہوتی اور یوں معلوم ہوتا کہ بڑی دلچسپ کہانی سننے کے دوران کسی نے زور سے 'ہوں' کی ہے۔"

یہ تشبیہ بھی غیر معمولی نہ ہی لیکن اس تک منٹو کے سوا کسی اور کے ذہن کی نارسائی اسے غیر معمولی بھی بنا دیتی ہے اور منٹو کی فنی عظمت کی طرف اشارہ بھی کرتی ہے۔

"گالی ——— یوں سمجھیے کہ کانوں کے راستے پگھلا ہوا سیسہ شائیں شائیں کرتا اس کے دل میں اتر گیا۔

(نعرہ)

"بار بار یہ دو گالیاں، جو سیٹھ نے بالکل پان کی پیک کے مانند اپنے منہ سے اگل دی تھیں، اس کے کانوں کے پاس زہریلی بھڑوں کی طرح بھنبھنانا شروع کر دیتی تھیں۔"

(نعرہ)

"دو گالیاں ——— اس کے جی میں آتی کہ اپنے سینے کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ ان دو پتھروں کو جو کسی حیلے گلتے ہی نہ تھے، باہر نکال لے۔"

(نعرہ)

ایک گالی یا دو گالیاں ——— میرے اور آپ کے لیے روزمرہ سنائی بے حقیقت باتیں ہیں۔ جنہیں آدمی صبح سے شام تک ہر ایک کے منہ سے نکلتے سنتا ہے۔ لیکن کیشو لال کے دل میں ان گالیوں نے جو اثر کیا ہے۔ اس کی شدت اور تڑپ کو منٹو ان گنت تشبیہوں کے ذریعہ پوری طرح واضح کر دینے پر تلا ہے۔

اوپر کی چاروں تشبیہوں میں کوئی نیا پن نہیں۔ لیکن ان فرسودہ تشبیہوں سے منٹو نے بار بار جو کام کیا ہے اس سے عمومیت میں خصوصیت پیدا ہوئی ہے ہر سطحیت میں گہرائی آئی ہے۔

منٹو نے ایک ہی تشبیہ سے ایک بہت وسیع منظر کی تصویر کھینچنے اور فضا قائم کرنے کی جو خدمت لی اس کی چند اور تصویریں دیکھیے۔ پہلی دو تصویریں "دھواں" کی ہیں۔

"موسم کچھ ایسی ہی کیفیت کا حامل تھا جو ربڑ کے جوتے پہن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔"

(دھواں)

"ایک کبوتر اور کبوتری پاس پاس پر پھلائے بیٹھے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دم پخت کی ہوئی ہنڈیا کی طرح گرم ہیں۔"

(دھواں)

"وہ کچھ اس طرح سمٹی جیسے کسی نے جلدی سے ریشمی کپڑے کا تھان کھول کر نیچے جھٹک دیا ہے۔"

(مصری کی ڈلی)

دو ایک مزے دار تشبیہیں اور دیکھیے اور اندازہ لگائیے کہ منٹو چیزوں کو کیسے کیسے گوشوں میں سے نکال کر منظر عام پر لاتا اور پڑھنے والے کے ذہن کو ہر دم ایک نیا نقش بنانے میں مدد دیتا ہے۔

"یہ اسٹوک کا رہی عجیب چیز ہے، دسے پر عشق کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسٹرائیل پی رہا ہے۔"

(سجدہ)

"اپنے آپ کو چھپانے کی بھونڈی کوشش میں وہ ایک ایسا بے جان لطیفہ بن کر رہ گیا تھا جو بڑے ہی خام انداز میں سنایا گیا ہو۔"

(سجدہ)

"وہ کرسی پر اس انداز میں اکیلا بیٹھا تھا جیسے شطرنج کا پٹا ہوا مہرہ بساط سے بہت دور پڑا ہے۔"

(سجدہ)

"اس کی شرارت اب دم کی گٹھری بن کر رہ گئی تھی۔"

(سجدہ)

"نئے سال کی آمد پر وہ خوش تھا۔ جیسے اکھاڑے میں کوئی نامور پہلوان اپنے نئے مدمقابل کی طرف خم ٹھونک کر بڑھتا ہے۔"

(نیا سال)

یہ سب تشبیہیں پڑھنے والے کے تصور اور تخیل کو زندگی کی ایک لہر دے کر ایک

ایسی تصویر بنانے میں مدد دیتی ہیں، جس کا ہر رنگ تیکھا اور ہر نقش واضح ہے۔

منٹو کی تشبیہوں کا یہ امتیاز ہے کہ ان میں سے کوئی زندگی کی تڑپ اور تیزی سے خالی نہیں ہر تشبیہ کے پیچھے ایک مکمل اور واضح تصویر چھپی ہوئی ہے جسے منٹو کی فنی چابکدستی اس طرح برمحل استعمال کرتی ہے کہ پڑھنے والا اس تصویر کا پورا تاثر قبول کرتا ہے اور وہی ذہنی اور جذباتی نتائج اخذ کرتا ہے جو افسانہ نگار کے ذہن میں ہیں۔

منٹو کا اسلوب اظہار جس میں الفاظ، فقروں اور تشبیہوں کو یکساں اہمیت ہے مکمل تاثر کی تخلیق کو اپنا نصب العین بناتا ہے۔ اور شاید بہت کم موقعے ایسے ہیں جن پر اسے اپنا فنی مقصود حاصل کرنے میں پوری کامیابی حاصل نہ ہوئی ہو۔

اس کی اس کامیابی میں تشبیہوں کے علاوہ ایک اور خاص چیز کو بھی دخل حاصل ہے۔ اور وہ ہے 'تکرار'۔

'تکرار' مشرقی اسلوب اظہار کی ایک ایسی خصوصیت ہے جسے نثر سے زیادہ نظم میں برتا گیا ہے لیکن اردو اور فارسی میں عموماً 'تکرار' کو ایک لفظی صنعت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس لفظی صنعت سے لکھنے والوں نے عموماً صوتی ترنم اور تاثر انگیزی کا کام لیا ہے۔

گو کبھی کبھی یہ تاثر محض صوتی ترنم و تاثر کے علاوہ جذباتی کیفیت کے اظہار کا وسیلہ بھی بنتا ہے۔

نثر میں مغربی اسالیب کے اثر سے لفظوں اور فقروں کی تکرار خاص عام ہو گا

ہے۔

چنانچہ ہمارے افسانہ نگاروں کے یہاں جا بجا اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن کسی افسانہ نگار نے اظہار کے وسیلے کو اپنے فن میں اس طرح شامل نہیں کیا۔

جیسے منٹو نے۔ منٹو کے مشہور افسانوں میں سے 'خوشیا'، 'نعرہ'، 'بلاؤز'، 'ہتک'، 'نیا قانون'، اور نسبتاً کم معروف افسانوں میں 'الو کا پٹھا'، اور 'قبض' اس فن کے بڑے کامیاب مظہر ہیں۔

'نعرہ'، میں کیشو لال اپنے سیٹھ کے ساتویں منزل والے بالا خانے سے نیچے اترا تو افسانہ نگار کے لفظوں میں:۔

"اسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اس کے کاندھوں پر دھر دی گئی ہیں"۔

اس لیے کہ دو مہینے کا کرایہ ادا نہ کرنے کی سزا میں سیٹھ نے اسے دو گالیاں دی تھیں وہ گالیاں اس کے پورے وجود میں سمائی جا رہی تھیں۔

ان گالیوں سے کیشو لال کے دل پر جو کچھ بیت رہی ہے اس کے اظہار کا بہترین ذریعہ منٹو نے تکرار کو بنایا ہے۔ یہ گالیاں اس کے ذہن اور جذبات بلکہ اس کے وجود پر کس طرح چھائی ہوئی ہیں اس کی تفصیل منٹو کی زبانی سنیے:۔

"—— مالک مکان نے غصے میں آکر اس کو گالی دی —— گالی —— یوں سمجھئے کہ کانوں کے

راستے پگھلا ہوا سیسہ شاہیں شاہیں کرتا اس کے دل میں اُتر گیا اور اس کے سینے کے اندر جو ہڑبڑ مچ گیا اس کا تو کچھ ٹھکانہ ہی نہ تھا۔"

"اس کے جی میں آئی کہ اس گالی کو جسے وہ بڑی حد تک نگل چکا تھا، سیٹھ کے چربیوں بھرے چہرے پر قے کر دے مگر وہ اس خیال سے باز آگیا کہ اس کا غرور تو باہر فٹ پاتھ پر پڑا ہے ——"

"سیٹھ نے اسے پھر گالی دی۔ اتنی موٹی جتنی اس کی چربی بھری گردن تھی۔ اور اسے یوں لگا کہ کسی نے اُوپر سے اس پر کوڑا کرکٹ پھینک دیا ہے ——"

"ایک نہیں دو گالیاں —— بار بار یہ دو گالیاں جو سیٹھ نے بالکل پان کی پیک کے مانند اپنے منہ سے اُگل دی تھیں اس کے کانوں کے پاس زہریلی بھڑوں کی طرح بھنبھنانا شروع کر دیتی تھیں اور وہ سخت بے چین ہو جاتا تھا۔"

چلتے چلتے ایک لنگڑے کتے سے اس کی ٹکر ہوئی۔ کتے نے اس خیال سے کہ شاید اس کا زخمی پیر کچل دیا گیا ہے، چاؤں کیا اور پرے ہٹ گیا اور وہ سمجھا کہ سیٹھ نے اسے پھر گالی دی ہے —— گالی —— گالی ٹھیک اس طرح اس سے اُلجھ کر رہ گئی تھی جیسے جھڑبیری کے کانٹوں میں کوئی کپڑا وہ جتنی کوشش اپنے آپ کو چھڑانے کی کرتا ہے اتنی ہی زیادہ زخمی ہوتی جا رہی تھی۔"

"سیٹھ نے ایک گالی دی اور وہ کچھ نہ بولا —— دوسری گالی دی تو بھی وہ خاموش رہا جیسے وہ مٹی کا پتلا ہو —— پر مٹی کا پتلا کیسے ہوا؟ اس نے ان دو گالیوں کو سیٹھ کے تھوک بھرے منہ سے نکلتے دیکھا، جیسے دو بڑے بڑے چوہے موریوں سے باہر نکلے ہوں۔"

"جب اس کے سامنے ایک موٹر نے اپنے ماتھے کی بتیاں روشن کیں تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ دو گالیاں پگھل کر اس کی آنکھوں میں دھنس گئی ہیں۔"

"گالیاں ــــ گالیاں ــــ کہاں تھیں وہ
گالیاں ؟ اس کے جی میں آئی کہ اپنے سینے کے اندر ہاتھ ڈال کر
وہ ان دو پتھروں کو جو کسی حیلے گلتے ہی نہ تھے، باہر نکال لے
اور جو کوئی بھی اس کے سامنے آئے اس کے سر پر دے مارے۔"

"اس کے دماغ میں آگ کا ایک چکر سا بن گیا۔ اس چکر میں
اس کے سارے پرانے اور نئے خیال ایک ہار کی صورت میں
گندھ گئے۔ دو مہینے کا کرایہ، اس پتھر کی بلڈنگ میں درخواست
لے کر جانا ــــ سات منزلوں کے ایک سو بارہ
زینے، سیٹھ کی بھدی آواز، اس کے سر پر مسکراتا ہوا بجلی
کا بلب اور ــــ یہ موٹی گالی ــــ پھر
دوسری اور اس کی خاموشی ــــ یہاں پہنچ کر آگ
کے اس چکر میں تڑتڑ گولیاں سی نکلنا شروع ہو جاتیں اور
اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کا سینہ چھلنی ہو گیا۔"

"نعرہ" میں گالیوں والے واقعہ کی تکرار سے منٹو نے آہستہ آہستہ کیشو لال کے ذہنی و جذباتی ہیجان کو واضح کرنے میں مدد لی ہے، اور اس تکرار اور بڑھتے ہوئے ہیجان

میں مکمل ہم آہنگی پیدا کر کے اس انجام کے لیے نفسیاتی اور فنی جواز پیدا کیا ہے جس میں کیشو لال کے دل کا سارا درد اور اس کی شخصیت کا سارا کرب و اضطراب سمٹ کر وہ نعرہ بن گیا۔ جس سے کیشو لال کے دل کو ضرور تسکین مل گئی۔ لیکن سننے والوں نے صرف یہ تبصرہ کیا۔ کہ "پگلا ہے"۔

منٹو اپنے فن میں افسانہ کی تمہید، اس کی اٹھان، اس کے نقطۂ عروج اور اس کے انجام کو جو اہمیت دیتے ہیں اور ان مختلف مراحل کے درمیان پورے خلوص اور انہماک سے ربط اور تسلسل کا جو رشتہ قائم کرتے ہیں، وہ 'نعرہ' میں گالیوں کے ذکر کی تکرار سے پورا ہوا ہے۔

تکرار ہی نے اس افسانے میں ایک خاص کردار کی ذہنی کیفیت کے اضطراب کی مصوری کی ہے۔ تکرار ہی نے افسانہ کو آہستہ آہستہ اٹھان کی طرف لے جا کر ایک سوچے سمجھے انجام تک پہنچایا ہے۔ اور تکرار ہی نے اس تاثر کی تکمیل کی ہے جو قاری کے نقطۂ نظر سے اس کا مقصود ہے۔

"بلاؤز" شباب کی نازک اور جاں گداز منزل میں قدم رکھنے والے مومن کی اس جنسی بیداری کی کہانی ہے۔ جس کے معنی اسے خود بھی اچھی طرح معلوم نہیں۔ اس نازک نفسیاتی موضوع کی کہانی منٹو نے چند تاثرات اور تصورات کو ایک ہی لڑی میں پرو کر تصورات کی تکرار کی زبانی سنائی ہے۔ اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ ایک دن مومن

"شکیلہ کی سفید بغل میں کالے کالے بالوں کا ایک گچھا نظر آگیا —— یہ گچھا اسے بہت بھلا معلوم ہوا۔ ایک سنسنی سی اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ ایک عجیب و غریب خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ یہ کالے کالے بال اس کی مونچھیں بن جائیں۔"

مومن کے دل میں اس کے بعد دھندلے دھندلے خیالات پیدا ہوتے رہے۔ لیکن وہ ان کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہا اور آخر ایک دن جب اس نے اپنا ٹرنک کھول کر اپنے عید کے لیے بنے ہوئے کپڑوں پر نظر ڈالی تو:-

"روی ٹوپی کا خیال آتے ہی اس کے سامنے اس کا پھندنا آگیا اور پھندنا فوراً ہی ان کالے بالوں کے گچھے میں تبدیل ہوگیا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھا تھا۔"

اور پھر کمرہ صاف کرتے ہوئے اس نے ساٹن کی چکیلی کترنیں اپنی جیب میں رکھ لیں اور اگلے دن یوں ہی الگ بیٹھ کر ان کے دھاگے الگ کرنے شروع کر دیئے۔

"حتیٰ کہ دھاگے کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں کا ایک گچھا سا بن گیا۔ اس کو ہاتھ میں لے کر وہ دباتا رہا۔ لیکن اس کے تصور میں شکیلہ

کی وہی بغل تھی جس میں اس نے کالے کالے بالوں کا ایک چھوٹا سا گچھا دیکھا تھا۔"

اس کے بعد وہ جب بھی اندر آکر بلاؤز کو دیکھتا تو:-

"اس کا خیال فوراً ان بالوں کی طرف دوڑ جاتا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھے تھے اور بالآخر ایک رات کو:"

"جب وہ سویا تو اس نے کئی اوٹ پٹانگ خواب دیکھے ڈپٹی صاحب نے پتھر کے کوئلوں کا ایک بڑا ڈھیر اس سے کوٹنے کو کہا۔

جب اس نے ایک کوئلہ اٹھایا اور اس پر ہتھوڑے کی ضرب لگائی تو وہ نرم نرم بالوں کا ایک گچھا بن گیا۔ یہ کالی کھانڈ کے مہین مہین تار تھے۔ جن کا گولہ بنا ہوا تھا۔ پھر یہ گولے کالے رنگ کے غبارے بن کر ہوا میں اڑنے شروع ہوئے۔ بہت اوپر جا کر یہ پھٹنے لگے۔ پھر آندھی آگئی اور مومن کی روی ٹوپی کا پھندنا کہیں غائب ہوگیا۔ پھندنے کی تلاش میں نکلا۔ دیکھی اور ان دیکھی جگہوں پر گھومتا رہا ایک کالی ساٹن کے بلاؤز پر اس کا ہاتھ پڑا۔ کچھ دیر تک وہ کسی

دھڑکتی ہوئی چیز پر اپنا ہاتھ پھیرتا رہا پھر دفعتاً بڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ تھوڑی دیر تک وہ کچھ نہ سمجھ سکا کہ کیا ہو گیا ہے"۔

اس نفسیاتی افسانے کی فنی ترتیب، اس کے اٹھان، اس کے ارتقا، اس کے منتہا اور اس کے انجام اور پھر سب کے باہمی ربط اور توازن میں منٹو نے ایک خاص تصور کی تکرار کو فن کی بنیاد بنایا ہے افسانے کے مرکزی کردار نے ذہنی کشمکش کے جو مراحل طے کئے ہیں۔ ان کے اظہار کے اور طریقے بھی ہو سکتے تھے۔

لیکن منٹو کے اس افسانے کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے تصورات کی جس تکرار کو ایک خاص تاثر پیدا کرنے کا فنی وسیلہ بنایا ہے وہی وسیلہ اس مقصد کے حصول کا بہترین ذریعہ ہو سکتا تھا۔

فنکار کی حیثیت سے منٹو نے اپنے لیے یہ امتیاز مخصوص کیا ہے کہ جب کسی خاص محل پر وہ کسی فنی اسلوب سے کوئی تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہی فنی اسلوب اس محل کا بہترین اسلوب معلوم ہوتا ہے۔

'نعرہ' اور 'بلاؤز' کی مثالوں سے منٹو کے فن میں تکرار کی جس اہمیت کی وضاحت ہوتی ہے وہی ایک نئے اسلوب سے 'بانجھ'، 'خوشیا'، 'الّو کا پٹھا' اور 'قبض' جیسے افسانوں میں بھی اجاگر ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

منٹو نے 'تکرار' کی طرح 'تضاد' کو بھی اپنے تاثرات کے اظہار کا ایک وسیلہ بنایا ہے اور اسے طرح طرح سے اپنے افسانوں میں برتا ہے۔ ہماری سیاسی،

معاشرتی اور اخلاقی زندگی میں قدروں کا جو حیرت انگیز تضاد ہے اسے منٹو نے ہمیشہ بڑے اندیشے اور تشویش کی نظر سے دیکھا اور اپنے افسانوں کے ذریعہ اس تضاد کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

سماج کے مختلف طبقوں میں اُونچ نیچ اور معاشرتی و معاشی کشمکش، زندگی کے متعلق دو مختلف افراد کے خیالات اور نظریات میں اختلاف اور ضد، ایک ہی فرد کے ظاہر و باطن میں بدیہی فرق اس تضاد کی بعض نمایاں شکلیں ہیں۔

منٹو نے اس تضاد کو اور اس کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں میں ظاہر ہونے والے ہر ایسے تضاد کو جو انسان کو فریب میں مبتلا کرتا اور اس کے سکون و مسرت کی بربادی کا باعث بنتا ہے، ایسے اسلوب ادا سے جس میں لفظ، فقرے اور افسانے کے مختلف اجزا مل جل کر ایک خدمت انجام دیتے ہیں، بے نقاب کیا ہے۔

تضاد کی یہ مختلف صورتیں کس کس شکل میں ان کے افسانوں میں نمایاں ہوتی ہیں اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

پہلا اقتباس 'نعرہ' کا ہے۔ جس میں کیشو لال کے جذبات کی مصوری میں تصورات کے اس تضاد سے مدد لی گئی ہے جو طبقاتی اُونچ نیچ کا پیدا کیا ہوا ہے:۔

"اس گھر کا اندھا لیمپ کئی بار بجلی کے اس بلب سے ٹکرایا جو مالک مکان کے گنجے سر کے اُوپر مسکرا رہا تھا۔ کئی بار اس کے پیوند لگے کپڑے ان کھونٹیوں پر لٹک کر، پھر اس کے بدن سے چمٹ گئے، جو دیوار میں گڑی چمک رہی تھیں"۔

ہی طبقاتی تضاد کی ایک شکل 'بلاؤز' میں اس طرح دکھائی دیتی ہے :۔

"______ نوکروں کے متعلق کون غور کرتا ہے۔ ہم بچپن سے لے کر
بڑھاپے تک وہ تمام منزلیں پیدل طے کر جاتے ہیں اور آس پاس کے
آدمیوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔"

دو کردار ایک ہی صورتِ حال کو اپنے اپنے جذبات اور تصورات کی روشنی میں کس کس رنگ میں دیکھتے ہیں، اس کا اظہار 'ہتک' میں کئی جگہ مادھو اور سوگندھی کے جذبات کو واقعات کی شکل دے کر کیا گیا ہے ان کئی تصویروں میں سے ایک یہ ہے :۔

"ایک ہاتھ سے سوگندھی نے پگڑی والے کی تصویر اُتار
دی اور دوسرا ہاتھ اس فریم کی طرف بڑھایا جس میں مادھو
کا فوٹو جڑا تھا۔ مادھو اپنی جگہ سمٹ گیا۔ جیسے ہاتھ اس کی طرف
بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں فریم کیل سمیت سوگندھی کے ہاتھ
میں تھا۔

زور کا قہقہہ لگا کر اس نے "اونہہ" کی اور دونوں فریم
ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیئے۔ دو منزلوں
سے جب فریم زمین پر گرے اور کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی
تو مادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی
ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے ہنس کر اتنا کہا۔" اچھا کیا۔

مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔"

آخری جملہ میں مادھو نے جو کچھ کہا ہے وہ اس کے دل کی بات نہیں۔ اس مجبوری اور بے بسی نے ایک پُر فریب جھوٹ کی شکل اختیار کی ہے۔ اس مجبوری اور بے بسی اور ظاہر و باطن کے تضاد کی ایک اور تصویر دیکھیے :۔

"______ مادھو ڈر گیا۔ وہ گری ہوئی ٹوپی اٹھانے
کے لیے جھکا تو سوگندھی کی گرج سنائی دی۔" خبردار۔ پڑی رہنے
دے وہیں ______ تو جا، تیرے پونا پہنچتے ہی میں اس
کو منی آرڈر کر دوں گا۔"

سوگندھی کے اس تلخ طنز بھرے جملے میں کئی تضاد ایک جگہ اکٹھے ہو گئے ہیں ایک تضاد تو وہ ہے جو سوگندھی کے ان جذبات کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جن میں حالات نے ایک نمایاں تغیر اور انقلاب پیدا کیا ہے۔ دوسرا تضاد اس طنز میں پوشیدہ ہے جس میں سوگندھی کا ایک ایک لفظ ڈوبا ہوا ہے۔ تیسرا تضاد الفاظ کے اس مفہوم سے ظاہر ہے جو گزرے ہوئے واقعات اور موجودہ صورتِ حال میں تصادم بن کر رونما ہوا ہے۔

'ہتک' کا خاتمہ جذباتی کشمکش کے اس تضاد کی ایک نفسیاتی اور فنکارانہ تصویر ہے :۔

"بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد

بھی جب اس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس
نے اپنے خارش زدہ کتے کی گود میں اٹھایا اور ساگوان کے
چوڑے چکلے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔"

معاشرتی، جذباتی اور نفسیاتی کیفیتوں کے تضاد کو ظاہر کرنے پر منٹو کو جو قدرت حاصل ہے اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں یہ تضاد بعض دوسری لفظی اور معنوی صورتوں میں بھی رُونما ہوتا ہے۔

ان کے فن کے دوسرے پہلوؤں کی وضاحت کے لیے اب تک جو بہت سی مثالیں پیش کی گئیں۔ ان میں جگہ جگہ اس کے مختلف رنگ جھلکتے دکھائی دیتے ہیں مثلاً 'نعرہ' کے پورے افسانے میں ابتدا اور انجام کا تضاد، دو طبقوں کے اندر کی زندگی کا تضاد اور دو مختلف آدمیوں کے ایک ہی بات کو دو متضاد رنگوں میں دیکھنے کا تضاد پوری طرح نمایاں ہے۔

اور اس ذکر کو ختم کرتے وقت محبت کے سلسلہ میں منٹو کی کہی ہوئی وہ بات اب بھی میرے ذہن میں تازہ ہے کہ حضرت آدم سے ماسٹر نثار تک ہر انسان نے محبت کی ہے۔

منٹو کے فن کی وہ ساری خصوصیتیں جن کا تعلق ایک طرف تو فن کے ان مطالبات سے ہے۔ جنہیں ہم تکنیک کے مبادیات اور اس کے لوازم کہہ سکتے ہیں اور دوسری طرف زبان و بیان اور اظہار و ابلاغ کے ان وسائل سے جن کی بدولت افسانہ نگار کا خیال

اس کے تاثرات و تصورات دوسروں کے ذہن اور قلب میں جگہ کرتے ہیں لیکن افسانہ نگار زندگی کے متعلق جو کچھ کہتا ہے۔

وہ صحیح مشاہدہ کی مدد سے اور کسی خاص تجربہ کی تفصیلات میں سے اپنے کام کی جزئیات منتخب کرکے، تفصیلات کا مکمل مشاہدہ اور کسی خاص محل کی ضروریات کے مطابق ان میں سے موزوں جزئیات کا انتخاب، یا افسانہ نگاری کے فن کے بڑے ضروری مطالبات ہیں۔

ہمارے اکثر اچھے افسانہ نگار ان مطالبات سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ ہر ایک نے اپنی مخصوص شخصیت اور منفرد انداز فکر کی بنا پر جزئیات نگاری کا ایک نیا انداز قائم کیا ہے۔ چنانچہ اس خاص نقطہ نظر سے منٹو کا ایک اپنا رنگ ہے جو کسی دوسرے کے رنگ سے نہیں ملتا۔

منٹو نے ہمیشہ کسی واقعہ یا کردار کے تاثرات ونقوش کی وضاحت کے لیے ایسی جزئیات کو زیادہ اہمیت دی ہے جنہیں دوسرے عموماً غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتے۔

منٹو جس طرح بیان و اظہار خیال کے معاملہ میں اور اپنے تصورات کی وضاحت کے لیے تشبیہوں کا استعمال کرتے وقت غیر اہم کو اہم اور غیر ضروری کو ضروری اور معمولی کو غیر معمولی پر ترجیح دے کر تاثر کی شدت اور گہرائی پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح جزئیات کے انتخاب کے سلسلہ میں بھی انہوں نے بظاہر غیر اہم اور معمولی پہلوؤں پر ترجیح دی ہے اور اپنی تصویر کو خواہ واقعہ کی ہو یا کردار کی انہیں معمولی رنگوں سے شوخ اور تیکھا بنایا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل چند مثالوں میں

دیکھئے :۔

" مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اس نے انار کلی میں دینو حلوائی
کی دوکان پر آدھ سیر دہی کی لسی پی کر ایک بڑی ڈکار لی اور مونچھوں
کو منہ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے لیے ہی بلند آواز میں کہا "ہت
تیری ایسی کی تیسی ۔"

یہ استاد منگو ہیں 'نیا قانون' میں ۔ اسی افسانے میں انہی کی دو تصویریں اور ملاحظہ ہوں :۔

" چھاؤنی پہنچ کر منگو نے سواری کو اس کی منزل مقصود پر اُتار دیا
اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں
دبا کر سلگایا اور اگلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا ۔"

گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی
نشست پر بیٹھے ہوئے گورے سے پوچھا :۔
" صاحب بہادر ! کہاں جانا مانگتا ہے ؟"
اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا ۔ صاحب بہادر کہتے
وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا
اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدہم سی لکیر ناک کے نتھنے سے
ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی ، ایک لرزش کے ساتھ
گہری ہو گئی ۔"

انہی چھوٹی چھوٹی جزئیات سے ہمیں استاد منگو کو پوری طرح پہچاننے اور اس کی شخصیت کی گہرائیوں میں جذب ہونے کا موقع ملا ہے ۔ "بچاما" میں گوپال کے چاچا جی کا ذکر ایک جگہ اس طرح آیا ہے :۔

" اس کو اپنے چاچا جی کی ڈانٹ اچھی طرح یاد تھی ۔ اس کے
چاچا جی لالہ پرشوتم داس تھانے دار لنگوٹ باندھے نل کی دھار
کے نیچے اپنی گنجی چندیا رکھے اور بڑی تو ند بڑھائے مونچھوں میں
سے آم کا رس چوس رہے تھے ۔"

"پہچان" میں کچھ شب زندہ داروں نے جن کمروں کا جائزہ لیا تھا ان میں سے ایک کی تصویر منٹو نے یوں بنائی ہے :۔

" کونے میں ایک بہت بڑا پلنگ تھا ۔ جس کے پائے رنگین
تھے ۔ اس پر میلی چادر بچھی ہوئی تھی ، تکیہ بھی بڑا تھا جس پر سُرخ رنگ
کے پھول کڑھے ہوئے تھے ۔ پلنگ کے ساتھ والی دیوار کے
کارنس پر تیل کی ایک میلی بوتل اور لکڑی کی کنگھی پڑی تھی ۔ اس
کے دانتوں میں سر کا میل اور کئی بال پھنسے ہوئے تھے ۔ پلنگ کے
نیچے ایک ٹوٹا ہوا ٹرنک تھا جس پر ایک کالی گرگابی رکھی تھی ۔"

" کپڑے اس کے خستہ حالت میں تھے لیکن میلے نہیں تھے کوٹ

کی آستینوں کے آخری حصے کثرتِ استعمال سے گھس گئے تھے اور بھوڑے نکل آئے تھے، کالر کھلا تھا اور قمیض میں ایک اور دھلائی کی مار تھی۔"

(بابو گوپی ناتھ)

"باورچی خانہ میں گرم مصالحہ کوٹتے وقت جب لوہے سے لوہا ٹکراتا اور دھمکوں سے چھت میں ایک گونج سی دوڑ جاتی تو موسن کے ننگے پیروں کو یہ لرزش بہت بھلی معلوم ہوتی۔"

(بلاؤز)

"وہ ساگوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی اس کی بانہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں۔ پتنگ کی کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں، جو اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے۔ دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت اُبھرا ہوا تھا۔ جو بار بار مونڈھنے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا، جیسے نچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں رکھ دیا گیا ہے۔"

(ہتک)

یہ منٹو کی جزئیات نگاری کی صرف چند مثالیں ہیں اور جن کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ منٹو نے کسی واقعے کی مصوری کرنے کسی ماحول یا فضا کا مجموعی تاثر قائم کرنے یا کسی کردار کی ظاہری ہیئت اور باطنی کیفیات بنانے کے لیے جو باتیں بیان کی ہیں۔ ان میں کبھی چھوٹی چیز اور چھوٹی بات کو چھوٹا سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا۔

منٹو فنکار تھا اور فنکار کے نزدیک کوئی بات اور کوئی چیز معمولی اور حقیر نہیں ہوتی۔ دوسروں کو حقیر اور معمولی نظر آنے والی چیزیں غیر معمولی تاثرات اور نتائج کی حامل بن سکتی ہیں۔ بشرطیکہ فنکار انہیں صحیح انداز سے اور عمل برتنے پر قادر ہو اور یہ قدرت منٹو میں بدرجہ اُتم موجود ہے۔

چھوٹی سے چھوٹی جزئیات انہیں عزیز بھی ہیں اور ان کی نظروں میں محترم بھی۔ جزئیات کی قدر پہچاننے، انہیں عزیز رکھنے اور محترم سمجھنے نے منٹو کے فن کو اکثر نگاہوں میں پسندیدہ بنا لیا ہے۔

منٹو کے فن کے مختلف پہلو، جن میں افسانہ کی ساخت، تشکیل اور اس کے اجزاء کے علاوہ اسلوب نگارش کی ساری خصوصیتیں شامل ہیں۔ یعنی تشبیہیں، استعارے، کنائیے، الفاظ اور فقروں کی تکرار اور ان کے استعمال میں تضاد کا صرف اس کی شخصیت، مزاج اور اندازِ نظر سے متاثر ہوتے ہیں۔

منٹو کے سوچنے کا ایک خاص انداز ہے۔ وہ زندگی اور اس کے مسائل کو مختلف اوقات میں مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے اور جو کچھ دیکھتا ہے اور سوچتا ہے اسے بغیر جھجک، خوف اور اندیشے کے جرأت کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔ ان سب باتوں میں اس کے جدت پسند مزاج اور توانا شخصیت کو بڑا دخل ہے۔

منٹو کی نظر میں گیرائی بھی ہے اور گہرائی بھی۔ سیاست، معاشرت، دین، اخلاق، معاشرہ اور فرد ان سب پر اس کی گہری نظر ہے۔ اس کی باریک بین اور نقطہ رس نگاہ ہر ایک کے حسن و قبیح، اچھائی برائی اور عیب و ہنر کو اس طرح دیکھتی ہے کہ اجتماعی و انفرادی زندگی

کی کوئی حقیقت اس سے پوشیدہ نہیں رہتی۔ اسی طرح عیب و ہنر پوری طرح احاطہ کر لینے کے بعد وہ ان میں سے ہر ایک کا اس نظر سے تجزیہ کرتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ "انسان نے انسان کے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے اور ایک ایسے انداز سے کی ہے کہ ناانصافی کا شکار ہونے والے خود نہیں جانتے کہ ان کے ساتھ کون ناانصافی
کر رہا ہے اور کس طرح کر رہا ہے۔

منٹو نے اس ناانصافی کو مٹانے اس کا پردہ فاش کرنے اور اس کا طلسم توڑنے کو
اپنے فن کا مقصود بنایا ہے۔

زندگی کے اس بہت بڑے اور بے حد اہم کام کا بیڑہ اٹھانا بجائے خود ایک مہم ہے لیکن اس سے سخت تر مہم یہ ہے کہ اسے کوئی عملی شکل دی جائے۔

منٹو کی مخصوص نظر نے انہیں جو کچھ دکھایا اور اس مشاہدہ کے بعد ان کے احساس درد نے انہیں جس کام کی طرف مائل کیا اس کے راستے میں بڑی رکاوٹیں ہیں۔ ہر ناانصافی کرنے والا سیاست، معیشت، دین اور اخلاق کے اداروں میں اجارہ داری کی لذتوں کے راز جاننے والا ایسے لوگوں کا سب سے بڑا دشمن ہے جو اس کے رخ سے فریب اور طلسم کے پردے اٹھا کر اس کی حقیقت کے گھناؤنے پن کو رسوا کرتا ہے اس لئے اس اہم کام کا بیڑا اٹھانے والے کو اتنا نڈر، اتنا بے خوف اور جری ہونا چاہیئے کہ وہ ہر دشمن کے مقابلے کے لیے سینہ سپر رہے۔

منٹو کو فطرت کی طرف سے یہ بے خوفی، یہ جرات اور یہ مردانگی عطا ہوئی تھی۔ اس کے اعصاب میں اتنی قوت تھی کہ وہ ہر وار کو دلیری سے روکے اور اس کی ضرب کو بے نیازی اور شگفتہ طبعی سے جھیل لے۔

منٹو کے فن پر ان کی اس بے خوفی نے بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔ اچھا بھی اور برا بھی۔ اچھا اس طرح کہ زندگی کی خرابیوں کا تجزیہ کر کے انہیں بے نقاب کر کے اور اس پر اکثر اوقات ایسی کاری ضرب لگا کے چوٹ کھانے والا تلملا کر رہ جائے، انسان اور زندگی کی بڑی خدمت کی ہے اور برا اس طرح کہ حیات انسانی کے بعض مستور پہلوؤں اور پوشیدہ رازوں کو اپنی دزدیدہ نگاہی سے یوں بے نقاب کیا ہے کہ چھپے ہوئے ناسوروں کی نمائش کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور کبھی کبھی حقیقت بینی اور حقیقت نگاری سے دنیا والوں کو صرف عریانی سکھائی ہے۔ یوں اس برے پہلو کا ایک اچھا پہلو بھی ہے اور اس کی تاویل یہی کہہ کر کی جا سکتی ہے کہ یہ سب کچھ منٹو کا مزاج تھا۔ اس کی شخصیت تھی اور منٹو فریب کھانے کی طرح فریب دینے کو بھی گناہ سمجھتا ہے۔ اس نے اپنے فن پر اپنے آپ کو پوری طرح بے نقاب کیا ہے۔

منٹو کے مزاج کی یہ سب خصوصیتیں جنہوں نے ان کی شخصیت اور فن دونوں میں امتیاز اور انفرادیت کے پہلو نمایاں کئے ہیں۔ سیاسی ماحول، معاشرتی انتشار، معاشی کشمکش اور بعض صورتوں میں ذاتی اور نجی حالات سے متاثر ہوتی رہی ہیں۔

منٹو نے اپنی زبردست قوت ارادی سے ہر طرح کے انتشار و کشمکش اور رکاوٹیں پیدا کرنے والے حالات کا مقابلہ بڑی دلیری اور جوانمردی سے کیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ اکثر منٹو نے ان سب قوتوں کو مغلوب کر کے اپنے لئے فتح کی راہ نکالی۔ اور اپنے فن کو زندہ رکھا ہے۔ لیکن دیکھنے والوں نے برے درد و غم کے ساتھ حالات کے طوفان، انتشار اور کشمکشوں کی ٹکراؤ اور ریلے سے اس کے پیروں کو ڈگمگاتے بھی دیکھا ہے۔ زندگی کے دشوار گزار سفر کے بعض سخت مرحلوں پر اور بعض منزلوں میں

اس نے اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کیا اور اپنے آپ کو عارضی شکست قبول کر لینے پر آمادہ پایا ہے۔ شکست کے اس احساس نے اس کے اعصاب پر بُرا اثر ڈالا اور جب اس نے اعصاب کی قوت برقرار رکھنے کے لیے کسی آب زندگی کو اپنا سہارا بنایا تو اس کے اعصاب پہلے سے بھی زیادہ بے بس اور مجبور ہو گئے۔ یوں کبھی کبھی اعصاب کی اس سمت کشمکش اور خارجی ماحول اور بیرونی زندگی کے اس تصادم میں کبھی کبھی اس کی شخصیت کی توانائی ہر چیز پر غالب بھی آتی ہے۔ اور منٹو کی شخصیت کی عظمت اور نمایاں ہوتی ہے۔ لیکن یہ عارضی فتح عموماً اعصاب کو اور زیادہ مغلوب اور پسپا بنانے کا پیش خیمہ بنتی ہے۔

منٹو کی زندگی میں ماحول اور اعصاب کی یہ جنگ یوں تو اس کی حیات فن کے ہر دور میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اس شکست و فتح کے تواتر کی جھلک نمایاں ہے کہ منٹو نے مدتوں کچھ نہیں لکھا۔

کبھی ایسا ہوا ہے کہ اس نے کئی کئی دن تک مسلسل ہر روز ایک افسانہ لکھا ہے اور اس طرح تواتر اور تسلسل سے لکھے ہوئے افسانوں میں بھی کسی ایک سلسلہ میں وہ کوئی اچھا افسانہ نہیں لکھ سکا اور کبھی ہر روز ایک اچھا افسانہ لکھا۔ مثلاً منٹو کے مجموعے "ٹھنڈا گوشت" کے سب افسانے (سوائے ٹھنڈا گوشت کے) ۲۳ اور ۳۱ جولائی ۱۹۵۰ء کے درمیان لکھے گئے۔

"بادشاہت کا خاتمہ" (مجموعہ) کے سب افسانے یکم جون ۱۹۵۰ء اور چودہ جون ۱۹۵۰ء کے درمیان لکھے گئے۔ اسی طرح "یزید" (مجموعہ) کے سب افسانے چار اکتوبر اور پندرہ نومبر ۱۹۵۱ء کے درمیان لکھے گئے۔

منٹو کے آخری دور کے بعض مجموعے جو زیر ترتیب اور زیر اشاعت ہیں۔ منٹو

کی اس ذہنی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اور ان افسانوں کو پڑھ کر پڑھنے والا نمایاں طور پر تین باتیں محسوس کرتا ہے۔ ایک بات تو یہ ہے کہ اس دور کے لکھے ہوئے افسانوں میں سے اکثر مجموعی حیثیت سے منٹو کے کم تر درجے کے افسانے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس دور میں بھی جب بظاہر منٹو کا فن انحطاط کی منزلوں سے گذر رہا ہے چند اچھے اور بہت اچھے افسانے بھی لکھے ہیں۔ اور تیسرے یہ کہ ان افسانوں میں بھی جنہیں ہم مجموعی حیثیت سے ان کے اچھے افسانے نہیں کہہ سکتے جا بجا منٹو کی ذہانت ان کی جدت پسندی، ان کی شوخی طبع، ان کی گہری طنز اور فن کے ساتھ ان کی فطری مناسبت جلوہ گر نظر آتی ہے۔

منٹو کی نادر الکلامی اور اس سے بھی بڑھ کر ان کے فن کی یہ خصوصیت کہ وہ کہانی کہنا جانتے ہیں اس دور میں بھی اسی تازگی اور توانائی کے ساتھ نمایاں ہے۔

منٹو کے ہر دور کے افسانے۔ بہت اچھے اور برے سب افسانے دیکھ کر پڑھنے والا ان کی جس خصوصیت سے سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے یہی ہے کہ ان افسانوں میں کہانی کی لذت ہے۔

منٹو کو فطرت نے ایک قصہ گو بنا کر بھیجا تھا۔ اس نے جب افسانہ نگاری شروع کی جب بھی اس میں فطرت کی دی ہوئی اس صلاحیت کو برتنے کی پوری قوت تھی اور جب اس نے مجبور اور بے بس ہو کر مرنے سے چند دن پہلے تک افسانے لکھے تو اس کی یہ صلاحیت اس میں اپنے پورے محاسن کے ساتھ موجود تھی۔

منٹو کو ایک قصہ گو کی حیثیت سے کئی گُر کی باتیں معلوم تھیں اور قصہ گوئی کے ساتھ اس کے فطری میلان اور فن کے ساتھ اس کے بے پایاں لگاؤ نے اس میں ان گُر کی باتوں

سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کی عادت پیدا کر دی تھی۔

منٹو کو علم تھا کہ زندگی میں ہر قدم پر ایک کہانی ہے ہر انسان اور ہر ذات خواہ وہ کتنا ہی کم حیثیت اور کیسا ہی معمولی کیوں نہ ہو کہانی کا بڑا موزوں اور دلچسپ موضوع ہے۔ لیکن اس کے لیے ایک شرط ہے اور بظاہر بہت معمولی ہونے کے باوجود یہ شرط قصہ گوئی کے لیے بڑی اہم ہے اور وہ شرط یہ ہے کہ کہانی لکھنے والا ایک ایسا انداز اختیار کرتا جاتا ہو کہ کہانی شروع ہوتے ہی اس میں اور کہانی سننے یا پڑھنے والے میں انتہائی یگانگت اور بے تکلفی کا رشتہ قائم ہو جائے۔

پڑھنے یا سننے والا یہ محسوس کر سکے کہ قصہ گو اسے اپنا ہمراز سمجھ کر اسے اپنے دل کی بڑی سے بڑی بات بتانے میں بھی تامل نہیں کرے گا۔ وہ اپنی خوشی اور غم میں اسے پوری طرح شریک کرے گا۔

کہانی سننے والے کے دل میں اپنی طرف سے یہ اعتماد پیدا کرنا اور ایک جان دو قالب ہو کر اس سے معمولی سے معمولی بات بھی اس طرح کہنا کہ جیسے وہ بے حد اہم ہے، کہانی لکھنے والے کی بڑی حیثیت ہے۔

منٹو قصہ گوئی کے میدان میں یہ جیت حاصل کرنے میں ماہر تھا۔ وہ بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی بات اس طرح باتیں کرنے کے انداز میں دوسروں سے کہہ سکتا تھا۔ کہ دوسرے اس کے جھوٹ کو، اس کے پُرفریب تخیل کو، اس ذہانت کی آغوش میں پلے ہوئے عجیب و غریب تصور کو سچ سمجھ کر قبول کرتے اور اس سے لطف لیتے تھے۔ معمولی سی بے حقیقت بات کس طرح کہانی بن سکتی ہے اس کی مثال منٹو کا افسانہ "جو ہے دال" ہے۔ کہانی میں کس طرح باتوں کا مزا پیدا کر کے اپنے پڑھنے والے کے احساسات میں مکمل مطابقت

پیدا کی جا سکتی ہے۔

اس کا اندازہ 'چغد'، 'مسں مین والا'، 'میرا نام رادھا ہے'، 'ٹوٹو'، 'تنگی آوازیں'، 'حامد کا بچہ'، 'رحمت خداوندی کے پھول'، 'خورشٹ'، 'باسط'، 'ٹیٹوال کا کتا'، 'چوہے'، 'کی' اور 'والد صاحب' کے افسانوں کو پڑھ کر ہو سکتا ہے اور کس طرح عجیب و غریب اور ناقابل اظہار خیال افسانوں میں جگہ پا کر اور منٹو کی چابکدستی کے حلقہ بگوش بن کر پڑھنے والوں کا دل موہ سکتے ہیں۔ یہ 'پیرن صاحب کرامات'، 'بادشاہت کا خاتمہ'، 'سکتے کی دعا' اور 'عزت کے لیے' جیسے افسانے پڑھ کر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

منٹو اپنے قریبی ماحول میں سے اتنی آسانی سے کوئی کہانی پیدا کر لیتا تھا کہ دیکھنے والے کو حیرت ہوتی تھی۔ وہ گپ کو کس طرح سنجیدہ مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔

یہ بات اور بھی زیادہ حیرت کی تھی۔ بلکہ یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ منٹو کہانی جانتا تھا اور اپنی اور بہت سی فنی کمزوریوں کے باوجود اپنے آخری دورِ انحطاط میں بھی وہ کہانی لکھنا بھولا نہیں تھا۔ اسی لئے اس انحطاط کے زمانے میں منٹو کے افسانے شوق سے پڑھے جاتے تھے۔

یہی ساری باتیں ہیں جو مل جل کر منٹو کے فن میں زندگی بھی پیدا کرتی ہیں اور انفرادیت اور عظمت بھی۔ لیکن منٹو میں اگر اسکنڈل کو افسانوں کا موضوع بنانے کی کمزوری نہ ہوتی پڑھنے والوں میں کبھی کبھی ایک ہنگامہ اور گرما گرمی پیدا کر دینے کے لیے وہ اگر چونکا دینے والی باتیں کہنے اور لکھنے پر اصرار نہ کرتا وہ اگر اپنی طنز کو اصلاح کے بلند مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے بجائے کبھی کبھی اسے زہر میں بجھے ہوئے تیروں کی طرح برتنے اور دوسروں کو چرکے دے کر اس میں لذت محسوس کرنے کی عادت ترک کر سکتا اور جنسی تجزیہ

کو نفسیات کی نازک حدود میں رکھنے کے بجائے اسے کوچہ و بازار میں رسوا کرنے سے پرہیز کرسکتا تو منٹو یقیناً اس سے بھی بڑا فنکار ہوتا۔ جیسا کہ وہ اب تھا۔

اس لئے کہ اس سے انکار کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں کہ وہ ان چند کمزوریوں کے باوجود بہت بڑا فنکار تھا اس کے مشاہدہ، تخیل، التصور، فکر اور احساس میں اس کی شخصیت کا گہرا رنگ ہے اور شخصیت میں غیر معمولی قوت و توانائی، وہی قوت و توانائی اس کے پورے فن پر چھائی ہوئی ہے۔ اور آنے والے ہر دور میں ہر طرح کے حوادث کے خلاف سپر بن کر اس کی حفاظت کرے گی اور اسے زندہ رکھے گی ——— منٹو مر گیا ——— لیکن اس کا فن اسے مرنے نہیں دے گا۔

انارکلی

نام اُس کا سلیم تھا مگر اس کے یار دوست اُسے شہزادہ سلیم کہتے تھے غالباً اس لیے کہ اس کے خدوخال مغلئی تھے خوبصورت تھا۔ چال ڈھال سے رعونت ٹپکتی تھی۔ اُس کا باپ پی ڈبلیو ڈی کے دفتر میں ملازم تھا۔ تنخواہ زیادہ سے زیادہ دو سو روپے ہوگی مگر بڑے ٹھاٹ سے رہتا ظاہر ہے کہ رشوت کھاتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ سلیم اچھے سے اچھا کپڑا پہنتا۔ جیب خرچ بھی اُس کو کافی ملتا تھا اس لیے کہ وہ اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا۔ بہت بن ٹھن کے رہتا۔ اُس کے پاس کئی سوٹ کئی قمیصیں تھیں جو وہ بدل بدل کے پہنتا۔ شو کم از کم بیس کے قریب ہوں جب کالج میں تھا۔ تو کئی لڑکیاں اُس پر جان چھڑکتی تھیں۔ مگر وہ بے اعتنائی برتتا۔ آخر اُس کی آنکھ ایک شوخ و شنگ لڑکی جس کا نام سیما تھا اس سے لڑ گئی۔

سلیم نے اس سے راہ و رسم پیدا کرنا چاہا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ اس کا التفات حاصل کرلے گا۔ نہیں وہ تو یہاں تک سمجھتا تھا کہ سیما اس کے قدموں میں گر پڑے گی اور اس کی ممنون و متشکر ہوگی کہ اس نے محبت کی نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

ایک دن کالج میں سلیم نے سیما سے پہلی بار مخاطب ہو کر کہا۔

آپ کتابوں کا اتنا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔

لائیے مجھے دے دیجئے ——— میرا تانگہ باہر موجود ہے۔ آپ کو اور اس بوجھ کو آپ کے گھر تک پہنچا دوں گا۔

سیما نے اپنی بھاری بھرکم کتابیں بغل میں دابتے ہوئے بڑے خشک لہجے میں جواب دیا۔

آپ کی مدد کی مجھے کوئی ضرورت نہیں ——— بہرحال شکریہ ادا کیے دیتی ہوں۔

شہزادہ سلیم کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ پہنچا۔ چند لمحات کے لیے وہ اپنی خفت مٹاتا رہا۔ اس کے بعد اس نے سیما سے کہا۔

عورت کو مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے ——— مجھے حیرت ہے کہ آپ نے میری پیش کش کو کیوں ٹھکرا دیا؟

سیما کا لہجہ اور زیادہ خشک ہوگیا۔

عورتوں کو مرد کے سہارے کی ضرورت ہوگی ——— مگر فی الحال

مجھے ایسی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ آپ کی پیش کش کا شکریہ میں ادا کر چکی ہوں۔ اس سے زیادہ آپ اور کیا چاہتے ہیں۔ یہ کہہ کر سیما چلی گئی۔

شہزادہ سلیم جو انارکلی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں جھپکتا رہ گیا۔ اس نے بہت بری طرح شکست کھائی تھی۔ اس سے قبل اس کی زندگی میں کئی لڑکیاں آچکی تھیں۔ جو اس کی آبرو کے اشارے پر چلتی تھیں۔ مگر یہ سیما کیا سمجھتی ہے اپنے کو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خوبصورت ہے جتنی لڑکیاں میں نے اب تک دیکھی ہیں اُن میں سب سے زیادہ حسین ہے مگر مجھے ٹھکرا دینا یہ بہت بڑی زیادتی ہے۔

میں ضرور اس سے بدلہ لوں گا ——— چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

شہزادہ سلیم نے اس سے بدلہ لینے کی کئی اسکیمیں بنائیں مگر بار آور ثابت نہ ہوئیں۔ اس نے یہاں تک سوچا کہ اس کی ناک کاٹ ڈالے۔ وہ یہ جرم کر بیٹھتا مگر اسے سیما کے چہرے پر یہ ناک بہت پسند تھی۔ کوئی بڑے سے بڑا مصور بھی ایسی ناک کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔

سلیم تو اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہوا۔ مگر تقدیر نے اس کی مدد کی اس کی والدہ نے اس کے لیے رشتہ ڈھونڈنا شروع کیا۔ نگاہِ انتخاب آخر سیما پر پڑی جو اس کی سہیلی کی لڑکی تھی۔

بات پکی ہوگئی مگر سلیم نے انکار کر دیا اس پر اُس کے والدین بہت ناراض

ہوئے گھر میں دس بارہ روز تک ہنگامہ مچا رہا۔

سلیم کے والد ذرا سخت طبیعت کے تھے۔ انہوں نے اس سے کہا۔

دیکھو تمہیں ہمارا فیصلہ قبول کرنا ہوگا۔ سلیم ہٹ دھرم تھا جواب میں یہ کہا۔

آپ کا فیصلہ کوئی ہائی کورٹ کا فیصلہ نہیں ——— پھر میں نے کیا جرم کیا ہے جس کا آپ فیصلہ سنا رہے ہیں۔ اس کے والد کو طیش آ گیا۔ تمہارا یہ جرم ہے کہ تم ناخلف ہو۔ اپنے والدین کا کہنا نہیں مانتے۔ عدول حکمی کرتے ہو۔ میں تمہیں عاق کردوں گا۔

سلیم کا جوش تھوڑا سا ٹھنڈا ہو گیا۔ لیکن ابا جان شادی میری مرضی کے مطابق تو ہونی چاہئے۔ بتاؤ تمہاری مرضی کیا ہے۔

اگر آپ ٹھنڈے دل سے سنیں تو عرض کروں۔

میرا دل کافی ٹھنڈا ہے ——— تمہیں جو کچھ کہنا ہے فوراً کہہ ڈالو۔ میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔

سلیم نے رُک رُک کر کہا مجھے ——— مجھے ——— ایک لڑکی سے محبت ہے۔

اس کا باپ گرجا کس لڑکی سے؟

سلیم تھوڑی دیر ہچکچایا ایک لڑکی ہے۔

کون ہے وہ ——— کیا نام ہے اس کا؟

سیما ——— میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔

میاں افتخار الدین کی لڑکی؟

جی ہاں اس کا نام سیما افتخار ہے میرا خیال ہے وہی ہے۔

اس کے والد بے تحاشا ہنسنے لگے ——— تمہاری شادی اس لڑکی سے قرار پائی ہے ——— کیا وہ تمہیں پسند کرتی ہے؟

سلیم بوکھلا سا گیا ——— یہ سلسلہ کیسے ہو گیا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہیں اس کا باپ جھوٹ تو نہیں بول رہا تھا؟

سلیم سے جو سوال کیا گیا تھا اس کا جواب اس کے والد کو نہیں ملا تھا چنانچہ انہوں نے کڑک کر پوچھا۔

سلیم مجھے بتاؤ کیا سیما تمہیں پسند کرتی ہے؟

سلیم نے کہا جی نہیں۔

تم نے یہ کیسے جانا؟

اس سے ——— اس سے ایک بار میں نے مختصر الفاظ میں ——— محبت کا اظہار کیا ——— لیکن اس نے مجھے ——— تمہیں درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔

جی ہاں ——— بڑی بے رُخی برتی۔

سلیم کے والد نے اپنے گنجے سر کو تھوڑی دیر کے لیے کھجلایا اور کہا تو پھر

رشتہ نہیں ہونا چاہیے۔ میں تمہاری ماں سے کہتا ہوں کہ وہ لڑکی والوں سے کہہ دے کہ لڑکا رضامند نہیں۔

سلیم ایک دم جذباتی ہو گیا نہیں ابا جان —— ایسا نہ کیجئے گا شادی ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور کسی کی محبت اکارت نہیں جاتی —— لیکن آپ اُن لوگوں کو —— میرا مطلب ہے سیما کو یہ پتہ نہ لگنے دیجئے کہ اس کا بیاہ مجھ سے ہو رہا ہے جس سے وہ بے رُخی اور بے اعتنائی کا اظہار کر چکی ہے۔

اس کے باپ نے اپنے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرا میں اس کے متعلق سوچوں گا یہ کہہ کر وہ چلے گئے کہ انہیں ایک ٹھیکیدار سے رقوم وصول کرنا تھی اپنے بیٹے کی شادی کے اخراجات کے سلسلے میں۔

شہزادہ سلیم جب رات کو پلنگ پر سونے کے لئے لیٹا تو اُسے انار کی کلیاں ہی کلیاں نظر آئیں۔ ساری رات وہ ان کے خواب دیکھتا رہا۔

گھوڑے پر سوار باغ میں آپہنچے —— شاہانہ لباس پہنے۔ اسپِ تازی سے اُتر کر باغ کی ایک روش پر جا رہا ہے —— کیا دیکھتا ہے کہ سیما انار کے بوٹے کی سب سے اونچی شاخ سے ایک نوخیز کلی توڑنے کی کوشش کر رہی ہے —— اس کی جھاری بھرکم کتابیں زمین پر بکھری پڑی ہیں —— زلفیں اُلجھی ہوئی ہیں۔ اور وہ اُچک اُچک کر اس شاخ

تک اپنا ہاتھ پہنچانے کی کوشش کر رہی ہے مگر ہر بار ناکام رہتی ہے وہ اس کی طرف بڑھا انار کی جھاڑی کے پیچھے چھپ کر اس نے اس شاخ کو پکڑا اور جھکا دیا۔

سیما نے وہ کلی توڑلی جس کے لیے اتنی کوشش کر رہی تھی —— لیکن فوراً اُسے اِس بات کا احساس ہوا کہ وہ شاخ نیچے کیسے جُھک گئی۔ وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ شہزادہ سلیم اس کے پاس پہنچ گیا سیما گھبرا گئی لیکن سنبھل کر اس نے اپنی کتابیں اٹھائیں اور بغل میں داب لیں۔

انار کلی اپنے جوڑے میں اُڑس لی اور یہ خشک الفاظ کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔ آپ کی امداد کی مجھے کوئی ضرورت نہیں تھی۔ بہر حال شکریہ ادا کئے دیتی ہوں۔

تمام رات وہ اسی قسم کے خواب دیکھتا رہا اس کی بھاری بھرکم کتابیں انار کی کلیاں اور شادی کی دھوم دھام۔

شادی ہو گئی۔ شہزادہ سلیم نے اس تقریب پر اپنی انار کلی کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ پائی تھی۔ وہ اس لمحے کے لیے تڑپ رہا تھا جب سیما اس کی آغوش میں ہو گی۔ وہ اُس کے اتنے پیار لے گا کہ وہ تنگ آکر رونا شروع کر دے گی۔

سلیم کو رونے والی لڑکیاں بہت پسند تھیں۔ اُس کا یہ فلسفہ تھا کہ عورت روتی ہو تو بہت حسین ہو جاتی ہے۔ اُس کے آنسو شبنم کے قطروں کے مانند

ہوتے ہیں۔ جو مرد کے جذبات کے پھولوں پر ٹپکتے ہیں۔ جن سے اسے راحت ایسی فرحت ملتی ہے جو اور کسی وقت نصیب نہیں ہو سکتی۔ رات کے دس بجے دولہن کو حجلۂ عروسی میں داخل کر دیا گیا۔

سلیم کو بھی اجازت مل گئی کہ وہ اس کمرے میں جا سکتا ہے۔ لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ اور رسم و رسوم سب ختم ہو گئی تھیں وہ کمرے کے اندر داخل ہوا۔

پھولوں سے سجی ہوئی مسہری پر دولہن گھونگھٹ کاڑھے ریشم کی گٹھڑی سی بنی بیٹھی تھی۔

شہزادہ سلیم نے خاص اہتمام کرایا تھا کہ پھول انار کی کلیاں ہوں وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ مسہری کی طرف بڑھا اور دولہن کے پاس بیٹھ گیا۔

کافی دیر تک وہ اپنی بیوی سے کوئی بات نہ کر سکا ——— اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کی بغل میں کتابیں ہوں گی۔ جن کو وہ اٹھانے نہیں دے گی۔

آخر اس نے بڑی جرأت سے کام لیا اور اس سے کہا سیما۔

یہ نام لیتے ہی اس کی زبان خشک ہو گئی۔ لیکن اس نے پھر جرأت فراہم کی اور اپنی دولہن کے چہرے سے گھونگھٹ اٹھا دیا اور بھونچکا رہ گیا۔ یہ سیما نہیں تھی کوئی اور ہی لڑکی تھی ——— انار کی ساری کلیاں اس کو ایسا محسوس ہوا کہ مرجھا گئی ہیں۔

——— (یکم جون [illegible]ء)

نعیمہ

تالیوں کے شور میں پرنسپل اپنی کرسی سے اٹھتا ہے اور طلبا اور طالبات سے مخاطب ہوتا ہے یہ رسم جب سے میں اس کالج میں پرنسپل مقرر ہوا ہوں ہر سال باقاعدہ ادا کی جاتی ہے ہر سال اس موقعے پر تالیوں کے شور کے ساتھ میں اپنی کرسی سے اٹھتا ہوں اور قریب قریب وہی تقریر کرتا ہوں۔ جو میں نے آج سے دس سال پہلے کی تھی۔ تمہیں دیکھ کر میرے دل میں وہی جذبات پیدا ہوتے ہیں جو اس سلسلے کے آغاز میں ہوئے تھے۔ آج جب میں نے غور کیا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں پوسٹ ماسٹر ہوں اور کالج کی یہ بلڈنگ بہت بڑا ڈاک خانہ۔ تم سب خطوط ہو جو کچھ دیر اس بلڈنگ میں رہ کر اپنے اپنے ٹھکانے پہنچا دیئے جاتے ہو ——— تم میں سے کچھ بیرنگ ہو جاتے ہیں جس کے باعث تمہارے والدین کو جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے کچھ غلط ایڈریس

کی وجہ سے اِدھر اُدھر بھٹکتے رہتے ہیں۔ بہرحال یہ کھیل ہے بہت دلچسپ ہے ——— ہرسال امتحانوں کا ایک چکر شروع ہوتا ہے ——— اس میں کچھ کامیاب ہوتے ہیں کچھ ناکام ——— حسرت اور غم کی ملی جلی لہریں میں ہرسال دیکھتا ہوں اس وقت میرے سامنے ایسے کئی چہرے ہیں جو کامیابی کے باعث تمتا رہے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ میں چند ایسے چہرے بھی دیکھ رہا ہوں جو ناکامی کے صدمے سے مُرجھائے ہوئے ہیں۔ خزاں اور بہار کا یہ ملا جلا موسم ہرسال آتا ہے اور گذر جاتا ہے ——— وہ لڑکیاں اور لڑکے جو بی اے کا امتحان پاس کر چکے ہیں یا تو اونچی تعلیم حاصل کرنے کے لیے کسی بڑے کالج میں داخل ہو جائیں گے یا تعلیم کا سلسلہ ختم کر کے دنیوی کاموں میں مصروف ہو جائیں گے وہ جو اس امتحان کی دیوار نہیں پھاند سکے دوبارہ کوشش کریں گے۔ جو یہاں سے جا رہے ہیں۔ ان کو میں الوداع کہتا ہوں اور ان کی کامیاب زندگی کے لیے دُعا کرتا ہوں۔ جو نئے آئے ہیں۔ میں ان کو خوش آمدید کہتا ہوں اور ان کے فائدہ کے لیے کہتا ہوں کہ اس تعلیم گاہ میں داخل ہوتے وقت ان لوگوں کو ایک نظر دیکھ لیں جو باہر جا رہے ہیں ——— جو خواہش کے باوجود اپنی کمزوریوں کے باعث یا کسی اور وجہ سے باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ان سے مجھے پوری پوری ہمدردی ہے خاص طور

پر نعیمہ سے جو محنت کرنے کے باوجود کسی سال بھی امتحان میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔ خدا کرے آئندہ سال نعیمہ کامیاب ہو جائے۔ تقریر ختم کرنے کے بعد جلسہ برخواست ہو جاتا ہے۔

کالج کی لڑکیوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو جاتی ہیں۔

ذکیہ۔ فرخندہ ——— کیا نعیمہ ہال میں موجود تھی۔

فرخندہ۔ نہیں تو۔

ذکیہ ——— تو پھر وہ آئی ہی نہیں۔

فرخندہ۔ بے چاری غم سے نڈھال ہو گی۔

ذکیہ۔ ایک بار فیل ہونے ہی سے آدمی کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ وہ بے چاری تو دوسری مرتبہ فیل ہوئی ہے۔

فرخندہ۔ محنت تو بے حد کرتی تھی۔

ذکیہ۔ اصل میں یہ سب اس کے مزاج کی خرابی کا نتیجہ ہے ——— کسی سے مدد لینے میں کیا مضائقہ ہے امتحان شروع ہونے سے دو مہینے پہلے میں نے کئی بار اس سے کہا نعیمہ تم میرے گھر آ جایا کرو۔ میں تمہیں ساری اکنامکس ازبر کرا دوں گی ——— بس یہ سنتے ہی جیسے اس کے مرچیں لگ گئیں۔ کہنے لگی تم اپنے آپ کو بہت وہ سمجھنے لگی ہو۔ تمہارے بغیر گویا اکنومکس کسی کو آ ہی نہیں سکتی ——— میں تو گدھی ہوں۔ بیوقوف

ہوں۔ اب فرخندہ تم ہی بتاؤ کیا میں نے چھیڑ خانی کے لیے اس کو اپنی مدد
پیش کی تھی۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ وہ اکنومکس میں بالکل صفر ہے ———
بس دماغ ہی جو ایسا پایا ہے کوئی اچھی بات بھی کرے تو اُسے بُری لگتی ہے

فرخندہ ——— میرے ساتھ بھی بالکل ایسا ہی ہوا میں نے کہا دیکھو
نعیمہ ایسا نہ ہو۔ تمہارا سائیکلوجی کا پرچہ کمزور رہ جائے۔ کہو تو میں اپنے
لئے ہوئے نوٹ دے دوں۔ بس یہ سنتے ہی بگڑ گئی۔ بکنے لگی۔ نوٹوں
کی اُس کو ضرورت ہوتی ہے جو کتاب سے کچھ نہ سیکھ سکے ——— ویسے
بازار میں عام بکتے ہیں۔ کوئی اتنی بڑی رقم خرچ تو نہیں ہوئی ——— بھئی وہ
دن اور یہ دن۔ میری زبان جلے جو میں نے پھر اس سے ایسی بات کی ہو۔

جمیلہ۔ کسی کو کیا پڑی ہے جو۔

ذکیہ۔ پڑی وڑی کی بات نہیں جمیلہ ——— ہمارے دل پتھر
کے تو نہیں۔ اس کو دیکھ کر کے دکھ نہیں ہوتا۔ اور ایسے لمحات میں منہ سے
ہمدردی کا کوئی کلمہ نکل ہی جاتا ہے۔

فرخندہ ——— پر اُسے تو ہمدردی کی ضرورت ہی نہیں ———
کاٹنے کو دوڑتی ہے اگر اس سے ہمدردی کا ایک لفظ بھی کہہ دیا جائے۔

ذکیہ ——— جانے اس کے مزاج میں تعلّی کہاں سے آگئی ہے۔

جمیلہ۔ اسے تعلّی کو چھوڑو۔ سب کو معلوم ہے کہ بے حد مفلس ہے۔

لیکن اگر اس سے کہو نعیمہ تم ہر روز یہ سبز ساڑھی ہی کیوں پہنتی ہو تو بگڑ کر
جواب دے گی۔ میرے پاس ایک نہیں۔ ایسی کئی ساڑھیاں ہیں مجھے یہ
رنگ پسند ہے۔

فرخندہ۔ سر میں تیل ایسا ڈالتی ہے کہ اس کی بدبو سے ناک پھٹ
جاتی ہے اس سے پوچھو تو یہی کہے گی ——— یہ خاص تیل ہے۔
اس سے بال لمبے ہوتے ہیں۔

جمیلہ۔ لمبے بالوں کی بچی۔

ذکیہ۔ نہیں جمیلہ ایسا نہ کہو۔
اس کا وحشیانہ پن دور ہو جائے تو اس جیسی اچھی سہیلی تمہیں چراغ لے کر
ڈھونڈنے پر بھی نہ ملے۔ لڑکیوں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک لڑکا انور
اُدھر سے گزرا۔ کافی خوبصورت تھا۔ اس نے سب سے پوچھا۔ کیا باتیں
ہو رہی ہیں؟

ذکیہ۔ ہم نعیمہ کا ذکر کر رہے تھے ——— آپ دوستوں وغیرہ
سے مل چکے۔

انور۔ دوستوں وغیرہ سے تو نہیں ملا ——— البتہ نعیمہ سے مل کے
آرہا ہوں۔

فرخندہ۔ کہاں ہے وہ؟

انور۔ باہر باغ میں۔

جمیلہ۔ چلو ذکیہ چلیں۔

انور نہیں اس وقت آپ اس کے پاس نہ جائیں۔ اس کی طبیعت مغموم ہے ——— کسی نے اس کو ذرا بھی چھیڑا تو آفت برپا ہو جائے گی۔

ذکیہ۔ یہ بڑی مصیبت ہے اب اگر کوئی اس سے ہمدردی کا اظہار کرنا چاہے تو کیا کرے۔

انور۔ بس خاموش رہے۔

ذکیہ۔ کیسے۔

انور۔ بالکل میری طرح ——— باغیچے کی طرف میرا گذر ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ بنچ پر بیٹھی ہے اور اس کی آنکھوں میں نامکمل آنسو ہیں۔ میرے قدم رُک گئے اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے اس کی طرف اس کے نامکمل آنسو تکمیل کی آرزو میں تڑپا گئے ——— اور میں یہاں چلا آیا۔

ذکیہ۔ تو مجھے اس کے پاس نہیں جانا چاہیے؟

انور۔ وہ اس وقت غضب ناک حالت میں ہے ناکامیوں کا اثر ایسے آدمیوں پر اسی قسم کا ہوتا ہے جنہیں ضرورت سے زیادہ خود پر اعتماد ہوتا ہے دراصل میں کوشش کے باوجود نعیمہ کو نہیں سمجھ سکا۔

ذکیہ۔ لیکن کلاس میں اُس سے آپ کا سلوک ویسا ہی تھا جیسے ایک باپ کا اپنی بیٹی سے ہوتا ہے۔

انور۔ لیکن اس کے باوجود وہ میری شفقت ٹھکراتی اور میری ہمدردی کو روندتی رہی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لڑکی کا انجام کیا ہوگا۔ تم نے غور نہیں کیا کہ وہ کس قدر دُبلی لگتی ہے۔ اس کی ہڈیاں باہر نکل آئی ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں ایک دن وہ اپنی زندگی کے پُراسرار محاذ پر لڑتی لڑتی تنہا ماری جائے گی۔ یہ کہہ کر انور ان لڑکیوں سے رخصت لے کر چلا گیا ——— اس کے قدم غیر ارادی طور پر اُسے باغیچے کی طرف لے گئے۔ نعیمہ بنچ پر بیٹھی تھی۔ انور اس کے پاس پہنچا۔

انور۔ نعیمہ ——— کیا میں تمہارے پاس آسکتا ہوں؟

نعیمہ ——— تمہیں کس نے روکا ہے۔

انور۔ تم یہاں دیر کی بیٹھی ہو۔

نعیمہ۔ کہتے ہو تو اُٹھ کر چلی جاتی ہوں۔

انور ——— یہ کیسی باتیں کرتی ہو ——— میں پوچھتا ہوں تنہائی میں تم بالکل نہیں گھبراتی ہو۔

نعیمہ۔ کیسی تنہائی ——— میں بالکل تنہا نہیں ہوں۔

انور۔ ہاں اب تم تنہا نہیں ہو۔

نعیمہ۔ اس سے پہلے بھی نہیں تھی ——— تم چلے جاؤ گے تو پھر بھی تنہا نہیں ہوں گی۔ تم ہمیشہ مجھے غلط سمجھتے رہے ——— تم کیا سب کے سب ——— مجھ میں کیا نقص ہے ——— کیا خرابی ہے جو دوسروں کے دل میں خواہ مخواہ ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے ——— ہمدردی ——— جاؤ اس ہمدردی کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔

انور۔ تم نے رونا شروع کر دیا۔

نعیمہ۔ جھوٹ بولتے ہو تم ——— میں تو ہنس رہی ہوں ——— تم سمجھتے ہو کہ میں تنہا ہوں بے یار و مددگار ہوں ——— اسی لئے تم مجھے اپنی ہمدردی کے سوکھے ٹکڑے دیتے ہو۔

میں یہ بھیک نہیں چاہتی ——— جاؤ ——— جاؤ ——— یہاں سے چلے جاؤ۔

انور محسوس کرتا ہے کہ اگر اس نے اس موضوع پر مزید گفتگو کی تو شاید نعیمہ کا دماغی توازن نہ بگڑ جائے اس لئے خاموشی سے چلا جاتا ہے نعیمہ پھوٹ پھوٹ کے رونا شروع کر دیتی ہے مگر آواز کوئی پیدا نہیں کرتی۔

انور اپنے گھر چلا گیا ——— وہ اکثر نعیمہ کے بارے میں سوچتا۔ اس نے کئی بار اس کو خط لکھے مگر اس کو اس کا ایڈریس معلوم نہیں تھا۔ اس لئے پھاڑ دیئے۔

ایک دن وہ باہر برآمدے میں بیٹھا کوئی ناول پڑھ رہا تھا کہ نوکر ایک خط لایا۔ یہ نعیمہ کا تھا۔ جس میں صرف ایک سطر تھی ——— مسٹر انور میں مرنے کے قریب ہوں، آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔

انور سخت گھبراہٹ میں اٹھا۔ اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ اس نے اپنے باپ کی موٹر لی ——— خط میں ایڈریس موجود تھا وہاں پہنچا۔

اندھیرا اور غلیظ سا کمرہ تھا ——— انور کو کچھ نظر نہ آیا۔

انور۔ نعیمہ نعیمہ ——— کہاں ہو تم۔

نعیمہ ——— ادھر میرے پاس آ جاؤ۔

اب اندھیرے میں انور کو سجھائی دینے لگا تھا اس نے دیکھا کہ ایک شکستہ سی چارپائی پر نعیمہ کی ہڈیوں کا ڈھانچہ لیٹا ہے۔ انور اس کے پاس بیٹھ گیا۔

نعیمہ۔ تمہیں حیرت ہو رہی ہے اس غلیظ کمرے کو دیکھ کر ——— اسے نہ دیکھو یہاں جس شے کو بھی دیکھو گے تمہیں حیرت ہو گی ——— سب سے بڑی حیرت انگیز چیز تو میں ہوں۔ مجھے دیکھو اور جتنا حیرت زدہ ہونا چاہو ہو لو۔

انور۔ یہ کیا ہو گیا تمہیں؟

نعیمہ۔ انور میری کشتی پاش پاش ہو چکی ہے ——— چپوؤں اور پتواروں کے بغیر اسے کئی برس منجدھار میں کھیتی رہی ہوں۔ اب میں اسے اپنے

ساتھ قبر میں لے جاؤں گی۔

انور ——— کیا وہاں اس کی مرمت ہو جائے گی؟ ——— تم بولتے کیوں نہیں؟

انور: میں سن رہا ہوں۔

نعیمہ: میں اپنی اس ٹوٹی پھوٹی کشتی کے لیے ادھر اُدھر سے چیتھڑے اکٹھے کرکے بادبان بناتی رہی لیکن طوفان نے بڑی بے رحمی سے ان کو چیر پھاڑ دیا۔

انور: مجھے بتاؤ یہ طوفان اتنے بے رحم کیوں ہوتے ہیں؟

انور ——— طوفان ہمیشہ بے رحم ہوتے ہیں نعیمہ۔

نعیمہ ——— تم ٹھیک کہتے ہو ——— میں نے بہت تکلیفیں برداشت کیں صرف اس لئے کہ بی۔اے کا امتحان پاس کر لوں اور خود کمانے کے قابل ہو جاؤں ——— لیکن ان تمام قربانیوں کا انجام تمہارے سامنے ہڈیوں کے ڈھانچے کی صورت میں پڑا ہے۔

نعیمہ کی آواز آہستہ آہستہ مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ انور کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔

نعیمہ۔ میں مر رہی ہوں انور اور تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ اب ایسا کرنا کہ میری یہ دو سبز ساڑھیاں جو اسٹول پر پڑی ہیں۔ اور یہ ساری کتابیں اُٹھا کر میرے ساتھ دفن کر دینا۔ ممکن ہے وہاں یہ چیزیں اور بھی زیادہ مہنگی ملیں۔ میں نے

بڑی مصیبتوں سے خریدی تھیں۔ اور دیکھو کسی اور کو میری موت کی خبر نہ ہو ——— مجھ سے اب زیادہ بولا نہیں جاتا ——— میرا خیال ہے مجھے اور بھی کچھ کہنا تھا۔

انور نے دیکھا کہ اس پہ حالتِ نزاع طاری ہے ——— اُس نے زار و قطار رونا شروع کر دیا ——— نعیمہ جس کی آنکھیں مُندرہی تھیں۔ بڑی مشکل سے کروٹ بدلی اور انور کے آنسو اپنے دوپٹے سے پونچھے اور کہا مجھے یاد آگیا ہے۔ جو مجھے تم سے کہنا تھا۔

انور ——— کیا کہنا تھا؟

نعیمہ مسکرائی ایک بیوقوفی کی بات ہے ——— اپنے ہونٹ میرے مردہ ہونٹوں کے ساتھ لگا دو۔

انور نے اس کی تعمیل کی ——— نعیمہ کو جو مسرت حاصل ہوئی وہ اس کی تاب نہ لا سکی اور اپنا آخری سانس اس بوسے کے سپرد کر دیا۔

———

(۱۲ مئی ۵۳ء)

بدتمیزی

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیسے سمجھاؤں۔

جب کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اس کو سمجھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔

آپ تو بس ہر بات پر گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ آپ نے یہ تو پوچھ لیا ہوتا کہ میں آپ سے کہنا کیا چاہتی ہوں اس کے پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی —— تم بس فقط لڑائی مول لینا چاہتی ہو۔ لڑائی میں مول لینا چاہتی ہوں کہ آپ —— سارے جہان اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ آئے دن مجھ سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ایک برس تک میں نے تم سے کوئی تلخ بات کی ہے نہ شیریں —— شیریں بات کرنے کا آپ کو سلیقہ ہی کہاں آتا ہے —— نوکر کو آواز دے کر بلائیں گے تو سارے محلے

کو پتہ چل جائے گا کہ آپ اُسے گولی سے ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔

میرے پاس بندوق ہی نہیں —— ویسے میں خرید سکتا ہوں مگر اس کو چلائے گا کون میں تو پٹاخے سے ڈرتا ہوں آپ بنیئے نہیں —— میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہ فراڈ میرے ساتھ نہیں چلے گا آپ کا۔

اب میں فراڈ بن گیا؟

آپ ہمیشہ سے فراڈ تھے۔

یہ فیصلہ آپ نے کن وجوہ پر قائم کیا۔

آپ جب پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے تو کیا آپ نے اپنے ابا جی کے جیب سے دو روپے نہیں نکالے تھے؟

کیوں؟

اس لئے کہ بھنگی کی لڑکی کو ضرورت تھی۔

بھنگی کی لڑکی سے آپ کی اتنی ہمدردی کیوں تھی؟

اس لئے کہ وہ بھنگی کی لڑکی تھی —— بہت بیمار —— والد صاحب سے اگر کہا جاتا تو وہ کبھی ایک پیسہ بھی اُسے نہ دیتے —— میں نے اسی لئے مناسب سمجھا کہ اُن کے کوٹ سے دو روپے نکال کر اس کو دے دوں —— یہ کوئی گناہ نہیں۔

جی ہاں —— بہت بڑا ثواب ہے ——

باپ کے کوٹ پر چھاپہ مار کر آپ تو اپنے خیال کے مطابق جنت میں اپنی سیٹ بک کروا چکے ہوں گے۔ لیکن میں آپ سے کہے دیتی ہوں کہ اس کی سزا آپ کو اتنی کڑی ملے گی کہ آپ کی طبیعت صاف ہو جائے گی۔ طبیعت تو میری یہاں ہر روز صاف کی جاتی ہے ——— آپ اتنی صاف ہو گئی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اس طبیعت کو کیچڑ میں لت پت کر دوں تاکہ تمہارا مشغلہ جاری رہ سکے۔ کیچڑ میں تو آپ ہر وقت لتھڑے رہتے ہیں۔

یہ سراسر بہتان ہے۔

بہتان کیا ہے ——— حقیقت ہے ——— آپ سر سے پاؤں تک کیچڑ میں دھنسے ہوئے ہیں۔ آپ کو کسی نفیس چیز سے دلچسپی ہی نہیں بات کریں گے تو غلاظت کی ——— نہاتے آپ نہیں۔

غضب خدا کا ——— میں تو دن میں تین مرتبہ نہاتا ہوں۔

وہ بھی کوئی نہانا ہے ——— بدن پر دو ڈونگے پانی کے ڈالے تولیے سے اپنا جسم پونچھا اور غسل خانے سے باہر نکل آگئے۔

دو ڈونگے تو نہیں کم از کم بیس ہوتے ہیں۔

تو ان سے بھی کیا ہوتا ہے ——— کیا آپ نے آج تک کبھی صابن استعمال کیا ہے؟ میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ صابن جلد کے لئے بہت مضر ہے۔

کیوں؟

اس لئے کہ اس میں تیزابی مادے ہوتے ہیں جو جلد کا ستیاناس کر دیتے ہیں میری جلد تو آج تک ستیاناس نہیں ہوئی ——— آپ کی جلد بہت ہی نازک ہو گی۔ نازک ہونے کا سوال نہیں ——— یہ ایک سائنٹفک بحث ہے ———"

میں سائنٹفک وائنٹفک کچھ نہیں جانتی ——— بس میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ صابن کیوں استعمال نہیں کرتے؟

بھئی نہیں بتا تو چکا ہوں کہ یہ مضر ہے۔

تو پھر آپ نہاتے کس طرح ہیں۔

نہانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے ——— پانی ڈالتے گئے اور نہاتے گئے۔

جسم پر آپ کوئی چیز نہیں ملتے ——— میرا مطلب ہے صابن نہیں تو کوئی اور چیز ملا کرتا ہوں۔

کیا؟

بیسن۔

وہ کیا ہوتا ہے۔

ارے بھئی چنے کا آٹا۔

آپ کی جو بات ہے نرالی ہے۔ میں تو آپ ایسے سنکی سے خدا قسم تنگ آگئی ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہاں جاؤں اپنے میکے چلی جاؤں ——— وہاں تمہیں اپنی ہم خیال مل جائیں گی۔

میں کیوں جاؤں وہاں ——— میں یہیں رہوں گی۔

میں نے تم سے آج ہی کہا ——— اس لیے کہ تم لاکھ مرتبہ مجھے یہ دھمکی دیتی رہی ہو کہ میں چلی جاؤں گی اپنے میکے۔

مجھے جب جانا ہوگا چلی جاؤں گی۔

آج تمہاری طبیعت نہیں چاہتی؟

آپ مجھے چڑانے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟

میں نے تو کوئی کوشش نہیں کی ——— اگر تم چاہتی ہو کہ کوشش کروں تو یقین مانو۔ تم ابھی تانگے لے کے اسٹیشن پہنچ جاؤ گی۔

کوشش کر کے دیکھ لیجئے ——— میں یہاں سے ایک اِنچ نہیں ہٹوں گی ——— یہ میرا گھر ہے ——— آپ کے باپ دادا کا ہے۔ میرے باپ دادا کا نام مت لیجئے۔ لیکن یہ تو بتائیے اُن بے چاروں کا کیا قصور تھا۔ قصور تو سارا میرا ہے ——— لیکن بیگم تم کبھی کبھی اتنا تو غور کر لیا کرو کہ میں نے آخر تمہیں کون سا جانی یا مالی نقصان پہنچایا ہے کہ تم لٹھ لے کر میرے پیچھے پڑ جاتی ہو ——— لٹھ تو ہمیشہ آپ کے ہاتھ میں رہا ہے ———

میں تو اُسے اُٹھا بھی نہیں سکتی۔ تم بڑے سے بڑا گرز اٹھا سکتی ہو ——— تم ایسی عورتوں میں بلا کی قوت ہوتی ہے ——— تم عقاب ہو ——— تمہارے سامنے تو میری حیثیت ایک چڑیا کی سی ہے۔

باتیں بنانا کوئی آپ سے سیکھے ——— آپ چڑیا ہیں ——— سبحان اللہ جب کڑکتے اور گرجتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیر دھاڑ رہا ہے۔

اس شیر کو پہلے ایک نظر دیکھ لو۔

کیا دیکھوں؟ ——— پندرہ برس سے دیکھ رہی ہوں۔

یہ خاکسار شیر ہے کیا!

شیر ہے مگر خاک میں لپٹا ہوا۔

اس تعریف کا شکریہ ——— اب آپ یہ بتائیے کہ آپ کہنا کیا چاہتی تھیں تمہاری باتیں تو صرف خدا ہی سمجھ سکتا ہے ——— میں کیا سمجھوں گا۔ خدا کو بیچ میں کیوں لاتے ہیں؟

خدا اگر بیچ میں نہ لایا جائے تو کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا۔

بڑے آئے ہیں آپ خدا کو ماننے والے۔

خدا کو تو میں ہمیشہ سے مانتا آیا ہوں ——— وہ طاقت جو دُنیا کنٹرول کرتی ہے ——— کنٹرول تو آپ مجھ پر کرتے آئے ہیں۔

"کس قسم کا؟"

ہر قسم کا —— میں آج تک اپنی مرضی کے موافق کوئی
چیز نہیں کر سکی —— کپڑے لیتا ہوں تو اس میں آپ کی مرضی کو دخل
ہوتا ہے کھانے کے بارے میں بھی آپ کی مرضی چلتی ہے آج یہ پکے
کل وہ پکے۔

اس میں تمہیں کیا اعتراض ہے۔

اعتراض کیوں نہیں —— میرا جی اگر کبھی چاہتا ہے کہ اوجھڑی
کھاؤں تو آپ نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔

اوجھڑی بھی کوئی کھانے کی شے ہے۔

آپ کیا جانیں کتنی مزیدار ہوتی ہے —— چونے میں ڈال کر
اُسے صاف کر لیا جاتا ہے اس کے بعد اچھی طرح گھی میں تلا جاتا ہے اللہ قسم
مزا آجاتا ہے۔

لاحول ولا —— میں ایسی غلط چیز کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔

اور ٹینڈے؟

بکواس ہیں —— سبزی کی سب سے بڑی توہین ہیں۔ اُن میں
کوئی رس ہوتا ہے۔

نہ لذت —— بس فقط ٹینڈے ہوتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں
آتا کہ وہ پیدا کس غرض کے لیے کیے گئے تھے —— نہایت واہیات

ہوتے ہیں —— میں تو اکثر یہ دعا مانگتا ہوں کہ ان کا وجود سرے سے
غائب ہو جائے۔ بڑے بے جان ہوتے ہیں —— ان کے مقابلے میں
کدو بدرجہا بہتر ہے حالانکہ وہ بھی سخت ناپسند ہے۔ آپ کو کون سی چیز پسند ہے؟
ہر اچھی چیز میں کیڑے ڈالتے ہیں —— بھنڈی آپ کو پسند نہیں۔ کہ اس
میں لیس ہوتی ہے —— گوبھی آپ کو نہیں بھاتی کہ اس میں یہ نقص
نکالا جاتا ہے کہ بدبو ہوتی ہے —— ٹماٹر آپ کو اچھے نہیں لگتے اس لئے
کہ اس کے چھلکے ہضم نہیں ہوتے۔

تم ان باتوں کو چھوڑو —— ٹینڈے گوبھی اور ٹماٹر جائیں جہنم میں۔
تم مجھے یہ بتاؤ کہ مجھ سے کہنا کیا چاہتی تھیں۔

کچھ بھی نہیں —— بس ایسے ہی آگئی —— میں نے دیکھا
کہ آپ کوئی کام نہیں کر رہے تو آپ کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

بڑی نوازش ہے آپ کی —— لیکن کچھ نہ کچھ تو ضرور کہنا ہو گا۔

آپ سے اگر کچھ بھی کہہ دیا تو اس کا حاصل کیا ہوگا۔

جو آگے آپ کو حاصل ہوتا رہا ہے اُسی حساب سے آج بھی حاصل ہو جائے
گا۔ آپ یہاں سے کچھ حاصل کیے بغیر ٹلیں گے کیسے!

میں آپ سے ایک خاص بات کرنے آئی تھی۔

کیا؟

میں —— میں کہنے آئی تھی کہ میری سمجھ میں نہیں آتا میں آپ کو کیسے سمجھاؤں۔

آپ کیا سمجھانے آئی تھیں مجھے۔

آپ کو خدا سمجھائے گا —— میں یہ کہنے آئی تھی کہ آپ پتلون پہن کر اس کے بٹن بالکنی میں بند نہ کیا کریں —— ہمسایوں کو سخت اعتراض ہے یہ بہت بڑی بدتمیزی ہے۔

(۲۲ مئی ۵۴ء)

قادرا قصائی

عیدن بائی آگرے والی چھوٹی عید کو پیدا ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی ماں زہرہ جان نے اس کا نام اسی مناسبت سے عیدن رکھا۔ زہرہ جان اپنے وقت کی بہت مشہور گانے والی تھی بڑی دور دور سے رئیس اس کا مجرا سننے کے لیے آتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ میرٹھ کے ایک تاجر عبداللہ سے جو لاکھوں میں کھیلتا تھا اسے محبت ہو گئی اس نے چنانچہ اسی جذبے کے ماتحت اپنا پیشہ چھوڑ دیا۔ عبداللہ بہت متاثر ہوا اور اس کی ماہوار تنخواہ مقرر کر دی۔ کوئی تین سو روپے کے قریب ہفتے میں تین مرتبہ اس کے پاس آتا اور رات ٹھہر کر صبح سویرے وہاں سے روانہ ہو جاتا۔

جو شخص زہرہ جان کو جانتے ہیں اور آگرے کے رہنے والے ہیں۔

ان کا یہ بیان ہے کہ اس کا چاہنے والا ایک بڑھئی تھا۔ مگر وہ اُسے منہ نہیں لگاتی تھی وہ بے چارہ ضرورت سے زیادہ محنت و مشقت کرتا اور تین چار مہینے کے بعد روپے جمع کر کے زہرہ جان کے پاس جاتا مگر وہ اُسے دھتکار دیتی۔

آخر ایک روز اس بڑھئی کو زہرہ جان سے مفصل گفتگو کرنے کا موقعہ مل ہی گیا پہلے تو وہ کوئی بات نہ کر سکا —— اس لیے کہ اُس پر اپنی محبوبہ کے حسن کا رُعب طاری تھا لیکن اُس نے تھوڑی دیر کے بعد جرأت سے کام لیا اور اس سے کہا۔

زہرہ جان میں ایک غریب آدمی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ بڑے بڑے دھن والے تمہارے پاس آتے ہیں اور تمہاری ہر ادا پر سینکڑوں روپے نچھاور کرتے ہیں —— لیکن تمہیں شاید یہ بات معلوم نہیں کہ غریب کی محبت دھن دولت والوں کے لاکھوں روپوں سے بڑی ہوتی ہے —— میں تم سے محبت کرتا ہوں —— معلوم نہیں کیوں۔

زہرہ جان ہنسی۔ اس ہنسی سے بڑھئی کا دل مجروح ہو گیا۔ تم ہنستی ہو۔ میری محبت کا مذاق اڑاتی ہو۔ اس لیے کہ یہ کنگلے کی محبت ہے جو لکڑیاں چیر کر اپنی روزی کماتا ہے —— یاد رکھو یہ تمہارے لاکھوں میں کھیلنے والے تمہیں وہ محبت اور پیار نہیں دے سکتے جو میرے دل میں تمہارے لیے موجود ہے۔ زہرہ جان اُکتا گئی۔ اس نے اپنے ایک میراثی کو بلایا اور اس سے کہا کہ بڑھئی کو باہر نکال دو۔ لیکن وہ اس سے پہلے ہی چلا گیا۔ ایک برس کے بعد عیدن پیدا ہوئی —— اس کا باپ عبداللہ تھا یا کوئی اور اس کے متعلق کوئی بھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ غازی آباد کے ایک ہندو سیٹھ کے نُطفے سے ہے —— کسی کے نُطفے سے بھی ہو مگر بلا کی خوبصورت تھی۔

اُدھر زہرہ جان کی عمر ڈھلتی گئی۔ اُدھر عیدن جوان ہوتی گئی۔ اس کی ماں نے اس کو موسیقی کی بڑی اچھی تعلیم دی۔ لڑکی ذہین تھی۔ کئی اُستادوں سے اس نے سبق لئے اور اُن سے داد وصول کی —— زہرہ جان کی عمر اب چالیس برس کے قریب ہو گی۔ وہ اب اُس منزل سے گذر چکی تھی جب کسی طوائف میں کشش باقی رہتی ہے وہ اپنی اکلوتی لڑکی عیدن کے سہارے جی رہی تھی۔ ابھی تک اس نے اس سے مجرا نہیں کرایا تھا وہ چاہتی تھی کہ بہت بڑی تقریب ہو جس کا افتتاح کوئی راجہ نواب کرے۔

عیدن بائی کے حسن کے چرچے عام تھے۔ دُور دور تک عیاش رئیسوں میں اس کے تذکرے ہوتے تھے۔ وہ اپنے ایجنٹوں کو زہرہ جان کے پاس بھیجتے اور عیدن کی نتھنی اُتارنے کے لیے اپنی پیش کش بھیجتے۔

مگر اس کو اتنی جلدی کوئی نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ نتھنی کی رسم بڑی

دھوم دھام سے ہو اور وہ زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرے ——— اس کی بیٹی لاکھوں میں ایک تھی سارے شہر میں اس جیسی حسین لڑکی اور کوئی نہیں تھی۔

اس کے حسن کی نمائش کرنے کے لیے وہ ہر جمعرات کی شام کو اس کے ساتھ پیدل باہر سیر کو جاتی۔ عشق پیشہ مرد اس کو دیکھتے تو دل تھام تھام لیتے۔ چینی چینی چولی میں گدرایا ہوا جوبن سڈول باہیں مخروطی انگلیاں جن کے ناخنوں پر جیتا جیتا لہو الیسا رنگ۔ ٹھگنا سا قد۔ گھنگھریالے بال قدم قدم پر قیامت ڈھاتی تھی آخر ایک روز زہرہ جان کی امید بر آئی۔ ایک نواب حیدن پر الیسا لٹو ہوا کہ وہ منہ مانگے دام دینے پر رضا مند ہوگیا۔ زہرہ جان نے اپنی بیٹی کی مسّی کی رسم کے لیے بڑا اہتمام کیا اور کئی دیگیں پلاؤ اور متنجن کی چڑھائی گئیں۔

شام کو نواب اپنی بگھی میں آئے۔ زہرہ جان نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی نواب صاحب بڑے خوش ہوئے۔ حیدن دُلہن بنی ہوئی تھی۔ نواب صاحب کے ارشاد کے مطابق اس کا مجرا شروع ہوا۔ پھٹ پڑنے والا شباب تھا جو نغمہ سرائی تھا۔ حیدن اس شام بلا کی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی اس کی ہر جنبش ہر ادا اس کے گانے کی ہر سُر جادو شکن تھی۔ نواب صاحب گاؤ تکیے کا سہارا لئے بیٹھے تھے انہوں نے سوچا کہ آج رات وہ جنت کی سیر کریں گے جو کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔ وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک ایک بے ہنگم سا آدمی

اندر داخل ہوا اور زہرہ جان کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ بہت گھبرائی یہ وہ بڑھئی تھا اس کا عاشق زار۔ بہت میلے اور گندے کپڑے پہنے تھا۔ نواب صاحب کو جو بہت نفاست پسند تھے ابکائیاں آنے لگیں۔ انہوں نے زہرہ جان سے کہا۔ یہ کون بدتمیز ہے۔

بڑھئی مسکرایا حضور میں ان کا عاشق ہوں۔

نواب صاحب کی طبیعت اور زیادہ مکدّر ہوگئی۔ زہرہ جان نکالو اس حیوان کو باہر۔ بڑھئی نے اپنے تھیلے سے آری نکالی اور بڑی مضبوطی سے زہرہ جان کو پکڑ کر اس کی گردن پر تیزی سے چلانا شروع کر دی۔ نواب صاحب اور میراثی وہاں سے بھاگ گئے۔ حیدن بے ہوش ہوگئی۔

بڑھئی نے اپنا کام بڑے اطمینان سے ختم کیا اور لہو بھری آری اپنے تھیلے میں ڈال کر سیدھا تھانے گیا اور اقبالِ جرم کر لیا ——— کہا جاتا ہے کہ اُسے عمر قید کی سزا ہوگئی تھی۔ حیدن کو اپنی ماں کے قتل ہونے کا اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ دو ڈھائی مہینے تک بیمار رہی ——— ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ وہ زندہ نہیں رہے گی۔ مگر آہستہ آہستہ اس کی طبیعت سنبھلنے لگی اور وہ اس قابل ہوگئی کہ چل پھر سکے۔ ہسپتال میں اس کی تیمارداری صرف اس کے استاد اور میراثی ہی کرتے تھے وہ نواب اور رئیس جو اس پر جان چھڑکتے تھے بھولے سے بھی اس کو پوچھنے کے لیے نہ آئے ——— وہ بہت دل برداشتہ ہوگئی۔

وہ آگرہ چھوڑ کر دہلی چلی آئی ——— مگر اس کی طبیعت اتنی اُداس تھی کہ کا بھی قطعاً مجرا کرنے کو نہیں چاہتا تھا۔ اس کے پاس بیس پچیس ہزار روپے کے زیورات تھے جن میں آدھے اس کی مقتول ماں کے تھے۔ وہ انہیں بیچتی رہی اور گزارہ کرتی رہی۔

عورت کو زیور بڑے عزیز ہوتے ہیں۔ اس کو بڑا دُکھ ہوتا تھا۔ جب وہ کوئی چوڑی یا نکلس اونے پونے داموں بیچتی تھی۔

لیکن آخر کیا کرتی۔ اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ راگ رنگ کی محفلیں قائم کرے ان دنوں پاکستان کے قیام کا مطالبہ بڑے زوروں پر تھا۔ آخر ایک دن اعلان ہوا۔ جو عیدن نے اپنے پانچ والو ریڈیو سیٹ پر سُنا کہ ہندوستان کے دو حصے ہو گئے۔ اس کے فوراً بعد فسادات شروع ہو گئے۔ ہندو مسلمانوں کو مارنے مسلمان ہندوؤں کو ——— عجب عالم تھا خون پانی سے بھی ارزاں ہو رہا تھا۔

مسلمان دھڑا دھڑ پاکستان جا رہے تھے کہ ان کی جانیں محفوظ رہیں۔ عیدن نے بھی فیصلہ کر لیا کہ وہ دہلی نہیں رہے گی۔ لاہور چلی جائے گی۔ بڑی مشکلوں سے اپنے کئی زیورات بیچ کر وہ لاہور پہنچ گئی۔ لیکن راستے میں اس کی تمام بیش قیمت پشوازیں اور باقی ماندہ زیور اس کے اپنے مسلمان بھائیوں ہی نے غائب کر دیئے جب وہ لاہور پہنچی تو وہ لٹی پٹی تھی ——— لیکن اس کا حسن ویسے کا

ویسا تھا۔ دہلی سے لاہور آتے ہوئے ہزاروں للچائی ہوئی آنکھوں نے اس کی طرف دیکھا مگر اس نے بے اعتنائی برتی وہ جب لاہور پہنچی تو اس نے سوچا کہ زندگی بسر کیسے ہو گی؟

اس کے پاس تو چنے کھانے کے لیے بھی چند پیسے نہیں تھے۔ لیکن لڑکی ذہین تھی۔ بس سیدھی اس جگہ پہنچی جہاں اس کی ہم پیشہ رہتی تھیں یہاں اس کی بڑی آؤ بھگت کی گئی۔ ان دنوں لاہور میں روپیہ عام تھا۔ ہندو جو کچھ یہاں چھوڑ گئے تھے۔ مسلمانوں کی ملکیت بن گیا تھا۔ ہیرا منڈی کے وارے نیارے تھے۔

عیدن کو جب لوگوں نے دیکھا تو وہ اس کے عاشق ہو گئے۔ رات بھر اُس کو سینکڑوں گانے سننے والوں کی فرمائشیں پوری کرنا پڑتیں۔ صبح چار بجے کے قریب جب کہ اس کی آواز جواب دے چکی ہوتی وہ اپنے سامعین سے معذرت طلب کرتی۔ اور اوندھے منہ اپنی چارپائی پر لیٹ جاتی۔

یہ سلسلہ قریب قریب ڈیڑھ برس تک جاری رہا۔ عیدن اس کے بعد ایک علیحدہ کوٹھا کرائے پر لے کر وہاں اُٹھ آئی کیونکہ جہاں وہ مقیم تھی۔ اُس نائکہ کو اُسے اپنی آدھی آمدن دینا پڑتی تھی۔ جب اس نے علیحدہ اپنے کوٹھے پر مجرا کرنا شروع کیا تو اس کی آمدن میں اضافہ ہو گیا۔ اب اُسے ہر قسم کی فراغت حاصل تھی اس نے کئی زیور بنوائے کپڑے بھی اچھے سے اچھے تیار کروائے۔

اسی دوران میں اس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو بلیک مارکیٹ

کا بادشاہ تھا۔ اس نے کم از کم دو کروڑ روپے کمائے تھے خوبصورت تھا اُس کے پاس تین کاریں تھیں۔ پہلی ہی ملاقات پر وہ عیدن کے حُسن سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اپنی کھلی سفید پیکارڈ اس کے حوالے کر دی۔

اس کے علاوہ وہ ہر شام آتا اور کم از کم دو اڑھائی سو روپے اس کی نذر ضرور کرتا ایک شام وہ آیا تو چاندنی کسی قدر میلی تھی۔ اس نے عیدن سے پوچھا کیا بات ہے آج تمہاری چاندنی اتنی گندی ہے عیدن نے ایک ادا کے ساتھ جواب دیا۔ آجکل لٹھا کہاں ملتا ہے!

دوسرے دن اس بلیک مارکیٹ بادشاہ نے چالیس تھان لٹھے کے بھجوا دیئے اس کے تیسرے روز بعد اس نے ڈھائی ہزار روپے دیئے کہ عیدن اپنے گھر کی آرائش کا سامان خرید لے۔

عیدن کو اچھا گوشت کھانے کا بہت شوق تھا۔ جب وہ آگرے اور دلی میں تھی تو اُسے عمدہ گوشت نہیں ملتا تھا۔ مگر لاہور میں اُسے قادرا قصائی بہترین گوشت مہیا کرتا تھا۔ بغیر ریشے کی ہر بوٹی ایسی ہوتی تھی جیسے ریشم کی بنی ہو۔

دکان پر اپنا شاگرد بٹھا کر قادرا صبح سویرے آتا اور ڈیڑھ سیر گوشت جس کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی ہوتی۔ عیدن کے حوالے کر دیتا اُس سے دیر تک باتیں کرتا رہتا۔ جو عام طور پر گوشت ہی کے بارے میں ہوتیں۔

بلیک مارکیٹ کا بادشاہ جس کا نام ظفر شاہ تھا۔ عیدن کے عشق میں بہت

بُری طرح گرفتار ہو چکا تھا اس نے ایک شام عیدن سے کہا کہ وہ اپنی ساری جائداد منقولہ اور غیر منقولہ اس کے نام منتقل کرنے کے لیے تیار ہے اگر وہ اُس سے شادی کر لے — مگر عیدن نہ مانی۔ ظفر شاہ بہت مایوس ہوا۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ عیدن اس کی ہو جائے مگر ہر بار اُسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ مجرے سے فارغ ہو کر رات کے دو تین بجے کے قریب باہر نکل جاتی تھی۔ معلوم نہیں کہاں۔

ایک رات جب ظفر شاہ اپنا غم غلط کر کے —— یعنی شراب پی کر پیدل ہی چلا آ رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ سائیں —— کے تکیئے کے باہر عیدن ایک نہایت بدنما آدمی کے پاؤں پکڑے التجائیں کر رہی ہے کہ خدا کے لیے مجھ پر نظرِ کرم کرو۔ میں دل و جان سے تم پر فدا ہوں —— تم اتنے ظالم کیوں ہو ——

اور وہ شخص جسے [illegible] دیکھنے پر ظفر شاہ نے پہچان لیا کہ قادرا قصائی ہے اُسے دھتکار رہا ہے جا —— ہم نے آج تک کسی کنجری کو منہ نہیں لگایا —— مجھے تنگ نہ کیا کر۔

قادرا اُسے ٹھوکریں مارتا رہا اور عیدن اسی میں لذت محسوس کرتی رہی۔

(۲۴ مئی ۵۴ء)

خودکشی

زاہد صرف نام ہی کا زاہد نہیں تھا اس کے زہد و تقوے کے سب قائل تھے اس نے پچیس برس کی عمر میں شادی کی۔ اس زمانے میں اس کے پاس دس ہزار روپے کے قریب تھے شادی پر پانچ ہزار صرف ہو گئے۔ اتنی ہی رقم باقی رہ گئی۔

زاہد بہت خوش تھا۔ اس کی بیوی بڑی خوش خصلت اور خوبصورت تھی اس کو اس سے بے پناہ محبت ہو گئی۔ وہ بھی اس کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ دونوں سمجھتے تھے کہ جنت میں آباد ہیں۔

ایک برس کے بعد ان کے ایک لڑکی پیدا ہوئی جو ماں پر تھی۔ یعنی ویسی ہی حسین بڑی بڑی غلافی آنکھیں ان پر لمبی پلکیں مہین ابرو۔ چھوٹا سا لب دہن ——

اس لڑکی کا نام سوچنے میں کافی دیر لگ گئی۔ زاہد اور اس کی بیوی کو دوسروں کے تجویز کیے ہوئے نام پسند نہیں آتے تھے وہ چاہتی تھی کہ خود زاہد نام بنائے۔

زاہد دیر تک سوچتا رہا۔ لیکن اس کے دماغ میں ایسا کوئی موزوں و مناسب نام نہ آیا۔ جو وہ اپنی بچی کے لیے منتخب کرتا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا اتنی جلدی کیا ہے نام رکھ لیا جائے گا۔ بیوی مُصر تھی کہ نام ضرور رکھا جائے میں اپنی بیٹی کو اتنی دیر بے نام نہیں رکھنا چاہتی وہ کہتا اس میں کیا حرج ہے —— جب کوئی اچھا سا نام ذہن میں آئے گا تو اس گُل گوتھنی کے ساتھ ٹانک دیں گے پھر میں اسے کیا کہہ کر پکاروں؟ —— مجھے بڑی اُلجھن ہوتی ہے۔

فی الحال بیٹیا کہہ دینا کافی ہے۔

یہ کافی نہیں ہے —— میری بیٹیا کا کوئی نام ہونا چاہیے۔

تم خود ہی کوئی منتخب کر لو۔

یہ کام آپ کا ہے میرا نہیں۔

تو تھوڑے دن انتظار کرو —— میں اُردو کی لغت لاتا ہوں۔

اس کو پہلے صفحے سے آخری صفحے تک غور سے دیکھوں گا —— یقیناً کوئی اچھا نام مل جائے گا میں نے آج تک یہ کبھی نہیں سُنا تھا کہ لوگ اپنے بچوں بچیوں کے
میں نے آج تک یہ کبھی نہیں سنا تھا کہ لوگ اپنے بچوں بچیوں کے نام ڈکشنریوں سے نکالتے ہیں۔

نہیں میری جان نکالتے ہیں۔ میرا ایک دوست ہے اس کے جب بچی پیدا ہوئی تو اس نے فوراً اردو کی لغت نکالی اور اس کی ورق گردانی کرنے کے بعد ایک نام چن لیا۔

کیا نام تھا۔

نکہت۔

اس کے معنی کیا ہیں۔

خوشبو۔

بڑا اچھا نام ہے ـــــ نکہت ـــــ یعنی خوشبو۔

تو یہی نام رکھ لو۔

زاہد کی بیوی نے اپنی بچی کو جو سو رہی تھی۔ ایک نظر دیکھا اور کہا نہیں ـــــ میں اپنی بیٹیا کے لیے پرانا نام نہیں چاہتی ـــــ کوئی نیا نام تلاش کیجئے ـــــ جائیے ڈکشنری لے آئیے۔

زاہد مسکرایا۔ لیکن میرے پاس پیسے کہاں ہیں۔

زاہد کی بیوی بھی مسکرائی میرا پرس الماری میں پڑا ہے اس میں جتنے روپے آپ کو چاہئیں نکال لیجئے۔

زاہد نے بہت بہتر کہا اور الماری کھول کر اس میں سے اپنی بیوی کا پرس نکالا۔ اور دس روپے کا نوٹ لے کر بازار روانہ ہو گیا کہ لغت خریدے۔

وہ کئی کتب فروش دکانوں میں گیا ـــــ کئی لغت دیکھے۔ بعض تو بہت قیمتی تھے جن کی تین تین جلدیں تھیں۔ کچھ بڑے ناقص ـــــ آخر اس نے ایک لغت جس کی قیمت واجبی تھی خرید لیا اور راستے میں اس کی ورق گردانی کرتا رہا تاکہ نام کا مسئلہ جلد حل ہو جائے۔

جب وہ انار کلی میں سے گزر رہا تھا تو اس کو ایک دوست مل گیا وہ اُسے اپنی بُوٹوں کی دُکان میں لے گیا ـــــ وہاں اُسے قریب ایک گھنٹے تک بیٹھنا پڑا کیونکہ بہت دیر کے بعد اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ جب اس کے دوست کو دورانِ گفتگو میں پتہ چلا کہ زاہد کے ہاں لڑکی ہوئی ہے تو وہ بہت خوش ہوا ـــــ تجوری میں سے گیارہ روپے نکالے اور زاہد سے کہا یہ اس بچی کو دے دینا کہنا تمہارے چچا نے دیئے ہیں ـــــ نام کیا رکھا ہے اس کا؟

زاہد نے لغت کی طرف دیکھا جس کی جلد لال رنگ کی تھی ابھی تک کوئی اچھا نام سوجھا نہیں۔ اس کے دوست نے جُوتے کو کپڑے سے صاف کرتے ہوئے کہا یار نام رکھنے میں دقت ہی کیا پیش آتی ہے۔ شمیمہ ہے شاہینہ ہے شریفاں ہے الماس ہے۔

زاہد نے جواب دیا۔ یہ سب بکواس ہے۔

اس کے دوست نے جوتا ڈبے میں رکھا۔ تو اب جو بکواس تم کرو گے۔ وہ بھی ہم سن لیں گے۔ اس کے بعد اٹھ کر اس نے زاہد کو گلے سے لگایا خدا اس کی عمر دراز کرے نام ہو نہ ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

زاہد جب دکان سے باہر نکلا تو اس نے سوچنا شروع کیا کہ واقعی نام میں کیا رکھا ہے خیراتی کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ خیرات بڑی کرتا ہے۔ عیدن کیا بلا ہے۔

اور گھسیٹا —— کیا اُسے لوگ گھسیٹنا شروع کر دیں ——

اور یہ زلزلہ —— خیراتی؟

اس کے جی میں آئی کہ لغت کسی گندی موری میں پھینک دے اور گھر جا کر اپنی بیوی سے کہے میری جان نام میں کچھ نہیں پڑا۔ بس یہ دُعا کرو کہ بچی کی عمر دراز ہو۔

وہ مختلف خیالات میں غرق تھا —— لیکن معلوم نہیں کیوں اس کا دل غیر معمولی طور پر دھڑک رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید یہ اس کی پراگندہ خیالی کا باعث ہے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اس کی طبیعت بہت زیادہ مضطرب ہو گئی۔ وہ چاہتا تھا کہ اُڑ کر گھر پہنچے اور اپنی بچی کی پیشانی چومے۔ بغل میں لغت تھی —— اس کو اس نے کئی بار دیکھنے کی کوشش کی مگر اس کا دل و دماغ متوازن نہیں تھا۔

اس نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا —— مگر تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہی بہت بُری طرح ہانپنے لگا اور ایک دکان کے تھڑے پر بیٹھ گیا

اتنے میں ایک خالی تانگہ آیا۔ اس نے اس کو ٹھہرایا اس میں بیٹھ کر تانگے والے سے کہا چلو مزنگ لے چلو۔ لیکن جلدی پہنچا دو۔ مجھے وہاں —— ایک بڑا ضروری کام ہے۔ مگر گھوڑا بہت ہی سست رفتار تھا یا شاید زاہد کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کو عجلت تھی وہ برق رفتاری سے گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ تانگے والے سے سخت سست الفاظ کہے تو وہ برداشت کرتا گیا۔ اس کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو اس نے زاہد کو تانگے سے اُتار دیا۔ ہائیکورٹ کے قریب اس نے زاہد سے کرایہ بھی طلب نہ کیا۔ زاہد اور زیادہ

پریشان ہوا وہ جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ کچھ دیر تک چوک میں کھڑا رہا۔ اتنے میں ایک پشاوری تانگہ آیا۔ اس میں بیٹھ کر وہ مزنگ پہنچا۔ کرایہ ادا کیا اور اپنے گھر میں داخل ہوا۔

کیا دیکھتا ہے کہ صحن میں کئی عورتیں کھڑی ہیں جو غالباً ہمسائی تھیں۔

وہ دروازے کے پاس رُک گیا۔ ایک عورت دوسری عورت سے کہہ رہی تھی مشکل ہی سے بچے گی بیچاری —— تشنج کے یہ دورے بڑے خطرناک ہیں۔

زاہد ان عورتوں کی پروا نہ کرتے ہوئے دیوانہ وار اندر چلا گیا اور اس کمرے میں پہنچا جہاں وہ اور اس کی بیوی رہتے تھے اندر داخل ہوتے ہی اس نے اپنی بیوی کی فلک شگاف چیخ سُنی۔

اس کی بچیا دم توڑ چکی تھی —— اور اس کی بیوی بے ہوش پڑی تھی۔

زاہد نے اپنا سر پیٹنا شروع کر دیا۔ ہمسائیاں پردے کو بھول کر بے اختیار اندر چلی آئیں اور زاہد کو اس کمرے سے باہر نکال دیا ایک ہمسائی کے شوہر کے پاس موٹر تھی وہ ڈاکٹر لے آیا۔ اس نے زاہد کی بیوی کو ایک دو انجکشن لگائے جن سے وہ وہ ہوش میں آگئی۔

زاہد ایک ایسے عالم میں تھا کہ اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں معطل ہو گئی تھیں وہ صحن میں ایک کرسی پر بیٹھا بغل میں لغت دبائے خلا میں دیکھ رہا تھا جیسے وہ اپنی بچی کے لیے کوئی نام تلاش کرنے میں محو ہے۔

بچی کو دفنانے کا وقت آیا تو زاہد بے ہوش ہوگیا۔ اس نے کوئی آنسو نہ بہایا۔ کفن میں پڑی بچی کو اٹھایا اور اپنے دوستوں اور ہمسایوں کے ہمراہ قبرستان روانہ ہوگیا۔ وہاں قبر پہلے ہی تیار کرالی گئی تھی۔ اس میں اس نے خود اُسے لٹایا اور اس کے ساتھ لغت رکھ دی۔ لوگوں نے سمجھا قرآن مجید ہے۔ انہیں بڑی حیرت ہوئی کہ مُردوں کے ساتھ قرآن کون دفن کرتا ہے یہ تو سراسر کفر ہے۔ لیکن اُن میں سے کسی نے بھی زاہد سے اس کے متعلق کچھ نہ کہا۔ بس آپس میں کھسر پھسر کرتے رہے۔

بچی کو دفنا کر جب گھر آیا تو اُسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی کو بہت تیز بخار ہے سرسام کی کیفیت ہے۔

فوراً ڈاکٹر بلایا گیا۔ اس نے اچھی طرح دیکھا اور زاہد سے کہا حالت بہت نازک ہے۔ میں علاج تجویز کئے دیتا ہوں لیکن میں صحت کی بحالی کے متعلق نہیں کہہ سکتا۔ زاہد کو ایسا محسوس ہوا کہ اس پر بجلی آن گری ہے لیکن اس نے سنبھل کر ڈاکٹر سے پوچھا۔

تکلیف کیا ہے۔ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ بہت سی تکلیفیں ہیں ——— ایک تو یہ کہ انہیں بہت بڑا صدمہ پہنچا۔ دوسری یہ کہ ان کا دل بہت کمزور ہے ——— تیسری یہ کہ انہیں ایک سو پانچ ڈگری بخار ہے۔ ڈاکٹر نے چند ٹیکے تجویز کئے دو نسخے پلانے والی دواؤں کے لکھے

لکھے اور چلا گیا۔ زاہد فوراً یہ سب چیزیں لے آیا۔ ٹیکے لگائے۔ دوائیں بڑی مشکل سے حلق میں ٹپکائی گئیں ——— لیکن مریضہ کی حالت بہتر نہ ہوئی۔

دس پندرہ روز کے بعد اُسے تھوڑا سا ہوش آیا۔ ہذیانی کیفیت بھی دور ہو گئی۔

زاہد نے اطمینان کا سانس لیا۔

اس کی پیاری حسین بیوی نے اُسے بلایا اور بڑی نحیف آواز میں کہا میرا اب آخری وقت آگیا ہے ——— میں چند گھڑیوں کی مہمان ہوں۔

زاہد کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کیسی باتیں کرتی ہو تم ——— بھئی خدانخواستہ اگر کچھ ہوگیا تو میں کہاں زندہ رہوں گا۔ اس کی بیوی نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ یہ سب بچنے کی باتیں ہیں ——— میں مرگئی کل دوسری آجائے گی۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے ——— اور ——— اور۔

اس نے ہچکی لی اور ایک سیکنڈ کے اندر اندر اس کی روح پرواز کر گئی۔

زاہد نے بڑے صبر و تحمل سے کام لیا۔ اس کے کفن دفن سے فارغ ہو کر وہ

رات کو گھر سے باہر نکلا اور ریلوے ٹائم ٹیبل دیکھ کر ریلوے لائن کا رُخ کیا رات کو ساڑھے نو بجے کے قریب ایک گاڑی آتی تھی وہ مغل پورہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ تاکہ وہاں پٹڑی پر لیٹ جائے اور اُسے کوئی دیکھ نہ سکے گاڑی آئے گی تو اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔

مجھے لمبی عمر کی کوئی خواہش نہیں —————— یہ جتنی جلدی مختصر ہو۔ اتنا ہی اچھا ہے میں اب اور زیادہ صدمے برداشت نہیں کر سکتا۔

جب وہ ریلوے لائن کے پاس پہنچا تو اُسے گاڑی کی تیز روشنی جو انجن کی پیشانی پر ہوتی ہے دکھائی دی —————— لیکن ابھی وہ دور تھی۔ اس نے انتظار کیا کہ جب قریب آئے گی تو وہ پٹڑی پر لیٹ جائے گا تھوڑی دیر کے بعد گاڑی اس کے قریب آ گئی۔

زاہد آگے بڑھا مگر اس نے دیکھا کہ ایک آدمی کہیں سے نمودار ہوا اور پٹڑی کے عین درمیان کھڑا ہو گیا۔

گاڑی بڑی تیز رفتاری سے آ رہی تھی اور قریب تھا کہ وہ آدمی اس کی جھپٹ میں آ جائے وہ تیزی سے لپکا اور اس آدمی کو دھکا دے کر پٹڑی کے اس طرف گرا دیا۔

گاڑی دندناتی ہوئی گذر گئی۔

اس آدمی سے زاہد نے کہا۔ کیا تم خودکشی کرنا چاہتے تھے ؟ اُس نے

جواب دیا۔

جی ہاں۔

کیوں —— ؟

بس صدمے اٹھاتے اٹھاتے اب جینے کو جی نہیں چاہتا۔

زاہد ناصح بن گیا۔

بھائی میرے زندگی زندہ رہنے کے لئے ہے۔ اس کو اچھی طرح استعمال کرو۔ خودکشی بہت بڑی بزدلی ہے۔ اپنی جان خود لینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ اٹھو اپنے صدموں کو بھول جاؤ —— انسان کی زندگی میں صدمے نہ ہوں تو وہ خوشیوں سے کیا حظ اٹھائے گا —— چلو میرے ساتھ۔

(۲۵ مئی ۷۴ء)

پشاور سے لاہور تک

وہ انٹر کلاس کے زنانہ ڈبے سے نکلی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا جاوید پشاور سے اُسے دیکھتا چلا آرہا تھا۔ راولپنڈی کے اسٹیشن پر گاڑی کافی دیر ٹھہری تو وہ ساتھ والے زنانہ ڈبے کے پاس سے کئی مرتبہ گزرا۔

لڑکی حسین تھی جاوید اس کی محبت میں گرفتار ہوگیا۔ اس کی ناک کی پھننگ پر چھوٹا سا تل تھا۔ کانوں میں ننھے منے گڑے تھے۔ جو اس کے چہرے پر بہت بھلے لگتے تھے۔ راولپنڈی اسٹیشن پر اس لڑکی نے کھانا منگوایا۔ بڑے اطمینان سے ایک ایک نوالہ اٹھا کر اپنے منہ میں ڈالتی رہی۔ جاوید دور کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھی ساتھ بیٹھ جائے اور دونوں مل کر کھانا کھائیں۔

وہ یقیناً اس کے پاس پہنچ جاتا مگر مصیبت یہ تھی کہ ڈبہ زنانہ تھا عورتوں

سے بھرا ہوا یہی وجہ ہے کہ جرأت نہ کر سکا۔ لڑکی نے کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھوئے۔ جو بہت نازک تھے۔ لمبی لمبی مخروطی اُنگلیاں جن کو اس نے اچھی طرح صاف کیا اور اٹیچی کیس سے تولیہ نکال کر اپنے ہاتھ پونچھے۔ پھر اطمینان سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

جاوید گاڑی چلنے تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر اپنے ڈبے میں سوار ہوگیا اور اُسی لڑکی کے خیالوں میں غرق ہوگیا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ بڑے اچھے گھرانے کی ہے۔ کانوں میں ٹاپس تھے دو انگلیوں میں اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہیرے کی انگوٹھیاں ہیں۔ لباس بہت عمدہ۔ ساٹن کی شلوار نفیس کی قمیض۔ شفون کا دوپٹہ۔ حیرت ہے کہ گھٹیا درجے میں کیوں سفر کر رہی ہے؟ پشاور سے آئی ہے وہاں کی عورتیں تو سخت پردہ کرتی ہیں۔ لیکن یہ برقعے کے بغیر وہاں سے گاڑی میں سوار ہوئی اور اس کے ساتھ کوئی مرد بھی نہیں —— نہ کوئی عورت اکیلی سفر کر رہی ہے آخر یہ قصہ کیا ہے میرا خیال ہے کہ پشاور کی رہنے والی نہیں وہاں کسی عزیز سے ملنے گئی ہوگی —— مگر اکیلی کیوں ہے —— کیا اسے ڈر نہیں لگا کہ اٹھا کر لے جائے گا کوئی —— ایسے تنہا حسن پر تو ہر مرد جھپٹا مارنا چاہتا ہے۔ پھر جاوید کو ایک اندیشہ ہوا —— کہ شادی شدہ تو نہیں۔ وہ دراصل دل میں تہیہ کر چکا تھا کہ اس لڑکی کا پیچھا کرے گا۔ اور رومان لڑا کر اس سے شادی کرے گا۔ وہ حرام کاری کا بالکل

قائل نہیں تھا۔ کئی اسٹیشن آئے اور گذر گئے۔ اسے صرف راول پنڈی تک جانا تھا کہ وہاں ہی اس کا گھر تھا۔ مگر وہ بہت آگے نکل گیا۔ ایک اسٹیشن پر چیکنگ ہوئی جس کے باعث اُسے جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ مگر اس نے اس کی کوئی پروانہ کی۔ ٹکٹ چیکر نے پوچھا۔

آپ کو کہاں تک جانا ہے۔

جاوید مسکرایا جی ابھی تک معلوم نہیں ——— آپ لاہور کا ٹکٹ بنا دیجئے کہ وہی آخری اسٹیشن ہے۔ ٹکٹ چیکر نے اُسے لاہور کا ٹکٹ بنا دیا۔ روپے وصول کئے اور دوسرے اسٹیشن پر اُتر گیا۔ جاوید بھی اُترا کہ ٹرین کو ٹائم ٹیبل کے مطابق پانچ منٹ ٹھہرنا تھا۔

ساتھ والے کمپارٹمنٹ کے پاس گیا وہ لڑکی کھڑکی کے ساتھ لگی دانتوں میں خلال کر رہی تھی۔

جاوید کی طرف جب اس نے دیکھا تو اس کے دل و دماغ میں چیونٹیاں دوڑنے لگیں۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اس کی موجودگی سے غافل نہیں ہے۔ سمجھ گئی ہے کہ وہ بار بار صرف اُسے ہی دیکھنے آتا ہے جاوید کو دیکھ کر وہ مسکرائی۔ اس کا دل باغ باغ ہو گیا۔ مگر جاوید فرطِ جذبات کی وجہ سے فوراً وہاں سے ہٹ کر اپنے ڈبے میں چلا گیا اور رومانوں کی دنیا کی سیر کرنے لگا ——— اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کے آس پاس کی تمام چیزیں مسکرا رہی

ہیں۔ ٹرین کا پنکھا مسکرا رہا ہے ——— کھڑکی سے باہر تار کے کھمبے مسکرا رہے ہیں ——— انجن کی سیٹی مسکرا رہی ہے اور وہ بدصورت مسافر جو اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کے موٹے موٹے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ ہے اس کے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ لیکن اس کا دل مسکرا رہا تھا اگلے اسٹیشن پر جب وہ ساتھ والے کمپارٹمنٹ کے پاس گیا تو وہ لڑکی وہاں نہیں تھی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کہاں چلی گئی؟ کہیں پچھلے اسٹیشن پر تو نہیں اُتر گئی جہاں اس نے ایک مسکراہٹ سے مجھے نوازا تھا! ——— نہیں نہیں غسل خانے میں ہوگی۔ وہ واقعی غسل خانے ہی میں تھی۔ ایک منٹ کے بعد وہ کھڑکی میں نمودار ہوئی۔ جاوید کو دیکھ کر مسکرائی اور ہاتھ کے اشارے سے اس کو بلایا۔ جاوید کانپتا لرزتا کھڑکی کے پاس پہنچا اس لڑکی نے بڑی مہین اور سُریلی آواز میں کہا۔ ایک تکلیف دینا چاہتی ہوں آپ کو ——— مجھے دو سیب لا دیجئے یہ کہہ کر اس نے اپنا پرس نکالا اور ایک روپے کا نوٹ جاوید کی طرف بڑھا دیا۔ جاوید نے جو اس غیر متوقع بلاوے سے قریب قریب برق زدہ تھا ایک روپے کا نوٹ پکڑ لیا۔ لیکن فوراً اس کے ہوش و حواس برقرار ہو گئے۔ نوٹ واپس دے کر اس نے لڑکی سے کہا۔

آپ یہ رکھیئے ——— میں سیب لے آتا ہوں۔ اور

وہ پلیٹ فارم پر اس ریڑھی کی طرف دوڑا جس میں پھل بیچے جاتے تھے اس نے جلدی جلدی چھ سیب خریدے کیونکہ وسل ہو چکی تھی۔

دوڑا دوڑا وہ اس لڑکی کے پاس آیا۔ اس کو سیب دیئے اور کہا معاف کیجئے گا —— وسل ہو رہی تھی اس لئے میں اچھے سیب چن نہ سکا۔

لڑکی مسکرائی —— وہی دل فریب مسکراہٹ ——

گاڑی حرکت میں آئی۔ جاوید اپنے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہوئے گویا ہانپ رہا تھا۔ لیکن بہت خوش تھا۔ اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کو دونوں جہان مل گئے ہیں۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی کسی سے محبت نہیں کی تھی۔ لیکن اب وہ اس کی لذت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کی عمر پچیس برس کے قریب تھی۔ اس نے سوچا کہ اتنی دیر میں کتنا خشک رہا ہوں۔ آج معلوم ہوا ہے کہ محبت انسان کو کتنی تر و تازہ بنا دیتی ہے —— وہ سیب کھا رہی ہوگی۔

لیکن اس کے گال تو خود سیب ہیں۔ میں نے جو سیب اس کو دیئے کیا وہ ان کو دیکھ کر شرمندہ نہیں ہوں گے۔ وہ میری محبت کے اشاروں کو سمجھ گئی۔ جب ہی تو وہ مسکرائی اور اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بلایا اور کہا کہ میں اُسے سیب لا دوں۔ مجھ سے اگر وہ کہتی کہ گاڑی کا رُخ پلٹ دوں تو میں خدا کی قسم اس کی خاطر یہ بھی کر دیتا۔ گو مجھ میں یہ طاقت نہیں۔

لیکن محبت میں آدمی بہت بڑے بڑے کام سرانجام دے سکتا ہے۔ فرہاد نے شیریں کے لیے پہاڑ کاٹ کر کیا نہر نہیں کھودی تھی!

میں بھی کتنا بے وقوف ہوں اس سے اور کچھ نہیں تو کم از کم یہی پوچھ لیا ہوتا کہ تمہیں کہاں تک جانا ہے —— خیر میں لاہور کا ٹکٹ تو بنوا چکا ہوں —— ہر اسٹیشن پر دیکھ لیا کروں گا، ویسے اب وہ مجھے بتائے بغیر جائے گی بھی نہیں —— شریف خاندان کی لڑکی ہے میرے جذبۂ محبت نے اُسے کافی متاثر کیا ہے —— سیب کھا رہی ہے۔ کاش کہ میں اس کے پاس بیٹھا ہوتا۔ ہم دونوں ایک سیب کو بیک وقت اپنے دانتوں سے کاٹتے —— اس کا منہ میرے منہ کے کتنا قریب ہوتا۔

میں اس کے گھر کا پتہ لوں گا —— ذرا اور باتیں کر لوں پھر راولپنڈی پہنچ کر امی سے کہوں گا کہ میں نے ایک لڑکی دیکھ لی ہے۔ اُس سے میری شادی کر دیجئے وہ میری بات کبھی نہیں ٹالیں گے —— بس ایک دو مہینے کے اندر اندر شادی ہو جائے گی۔ اگلے اسٹیشن پر جاوید جب اُسے دیکھنے گیا تو وہ پانی پی رہی تھی۔ وہ جرأت کر کے آگے بڑھا اور اس سے مخاطب ہوا۔ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو فرمائیے۔

لڑکی مسکرائی۔ وہی دلفریب مسکراہٹ مجھے سگریٹ لا

دیجئے۔

جاوید نے بڑی حیرت سے پوچھا آپ سگرٹ پیتی ہیں۔ وہ لڑکی پھر مسکرائی جی نہیں یہاں ایک عورت ہے پردہ دار اس کو سگرٹ پینے کی عادت ہے۔

اوہ ——— میں ابھی لایا ——— کس برانڈ کے سگرٹ ہوں ؟

میرا خیال ہے وہ گولڈ فلیک پیتی ہے۔

میں ابھی حاضر کئے دیتا ہوں یہ کہہ کر جاوید اسٹال کی طرف دوڑا۔ وہاں سے اس نے دو پیکٹ لئے اور اس لڑکی کے حوالے کر دیئے۔ اُس نے شکریہ اُس عورت کی طرف سے ادا کیا جو سگرٹ پینے کی عادی تھی جاوید اب اور بھی خوش تھا کہ اس لڑکی سے ایک اور ملاقات ہو گئی۔ مگر اس بات کی بڑی الجھن تھی کہ وہ اس کا نام نہیں جانتا تھا اس نے کئی مرتبہ خود کو کوسا کہ اس نے نام کیوں نہ پوچھا۔ اتنی باتیں ہوتی رہیں لیکن وہ اس سے اتنا بھی نہ کہہ سکا آپ کا نام ؟

اس نے ارادہ کر لیا کہ اگلے اسٹیشن پر جب گاڑی ٹھہرے گی تو وہ اس سے نام ضرور پوچھے گا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ فوراً بتا دے گی کیونکہ اس میں قباحت ہی کیا تھی۔ اگلا اسٹیشن بہت دیر کے بعد آیا اس لئے کہ فاصلہ بہت لمبا تھا۔ جاوید کو بڑی کوفت ہو رہی تھی۔ اس نے کئی

مرتبہ ٹائم ٹیبل دیکھا۔ گھڑی بار بار دیکھی ——— اس کا جی چاہتا تھا کہ انجن کے پر لگ جائیں تاکہ وہ اُڑ کر جلدی اگلے اسٹیشن پر پہنچ جائے۔

گاڑی ایک دم رُک گئی۔ معلوم ہوا کہ انجن کے ساتھ ایک بھینس ٹکرا گئی ہے وہ اپنے کمپارٹمنٹ سے اتر کر ساتھ والے ڈبے کے پاس پہنچا مگر لڑکی اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھی۔

مسافروں نے مری کٹی ہوئی بھینس کو پٹڑی سے ہٹانے میں کافی دیر لگا دی اتنے میں وہ جو غالباً دوسری طرف تماشا دیکھنے میں مشغول تھی آئی اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ جاوید پر اس کی نظر پڑی تو مسکرائی ——— وہی دل فریب مسکراہٹ۔

جاوید کھڑکی کے پاس گیا۔ مگر اس کا نام نہ پوچھ سکا۔

لڑکی نے اس سے کہا یہ بھینسیں کیوں گاڑی کے نیچے آجاتی ہیں ؟

جاوید کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ گاڑی چلنے والی تھی اس لئے وہ اپنے کمپارٹمنٹ میں چلا گیا۔ کئی اسٹیشن آئے مگر وہ نہ اترا۔ آخر لاہور آگیا۔ پلیٹ فارم پر جب گاڑی رُکی تو وہ جلدی جلدی باہر نکلا۔ لڑکی موجود تھی جاوید نے اپنا سامان نکلوایا اور اس سے جس نے ہاتھ میں اٹیچی کیس پکڑا ہوا تھا کہا لائیے یہ اٹیچی کیس مجھے دے دیجئے۔

اس لڑکی نے اٹیچی کیس جاوید کے حوالے کر دیا۔ قلی نے جاوید کا سامان اٹھایا

اور دونوں باہر نکلے۔

جاوید نے اس سے پوچھا آپ کو کہاں جانا ہے۔

لڑکی نے بڑے نرم و نازک لہجے میں جواب دیا جی راوی روڈ۔

چلئے میں آپ کو وہاں چھوڑ آتا ہوں۔

بہت بہت شکریہ۔

تانگہ راوی روڈ سے گذر رہا تھا ———— جاوید نے اس لڑکی سے پوچھا کہاں جایئے گا اب آپ؟

لڑکی کے ہونٹوں پر وہی دلفریب مسکراہٹ پیدا ہوئی جی ہیرا منڈی۔

جاوید بوکھلا سا گیا۔ کیا آپ وہاں رہتی ہیں۔

لڑکی نے بڑی سادگی سے جواب دیا ——— جی ہاں ———— میرا مکان دیکھ لیں۔ آج رات میرا مجرا سننے ضرور آیئے گا۔

جاوید پشاور سے لے کر لاہور تک اپنا مجرا سن چکا تھا۔ اس نے اس طوائف کو اس کے گھر چھوڑا اور اسی تانگے میں سید حالاریوں کے اڈے پر پہنچا اور راولپنڈی روانہ ہو گیا۔

(۲۷ مئی ۵۴ء)

بجلی پہلوان

بجلی پہلوان کے متعلق بہت سے قصے مشہور ہیں کہتے ہیں کہ وہ برق رفتار تھا۔ بجلی کے مانند دشمنوں پر گرتا تھا۔ اور انہیں بھسم کر دیتا تھا ———— لیکن جب میں نے اُسے مغل بازار میں دیکھا تو وہ مجھے بے ضرر کدو کے مانند نظر آیا۔ بڑا بھسپھس سا۔ توند باہر نکلی ہوئی۔ بند بند ڈھیلے گال لٹکے ہوئے البتہ اس کا رنگ سرخ و سفید تھا۔ وہ مغل بازار میں ایک بزاز کی دکان پر آلتی پالتی مارے بیٹھا رہتا تھا میں نے اس کو غور سے دیکھا مجھے اس میں کوئی غنڈہ پن نظر نہ آیا۔ حالانکہ اس کے متعلق مشہور یہی تھا کہ وہ بندوؤں کا سب سے بڑا غنڈہ ہے وہ غنڈہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لئے کہ اس کے خدوخال اس کی نفی کرتے تھے۔ میں تھوڑی دیر سامنے والی کتابوں کی دکان کے پاس کھڑا اس کو دیکھتا رہا۔ اتنے میں ایک

مسلمان عورت جو بڑی مفلس دکھائی دیتی تھی بزاز کی دکان کے پاس پہنچی۔

بجلی پہلوان سے اس نے کہا۔

مجھے بجلی پہلوان سے ملنا ہے۔ بجلی پہلوان نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا ماتا میں ہی بجلی پہلوان ہوں۔ اس عورت نے اس کو سلام کیا۔ خدا تمہیں سلامت رکھے ——— میں نے سنا ہے کہ تم بڑے دیالو ہو۔

بجلی نے بڑی انکساری سے کہا۔

ماتا دیالو پرمیشور ہے۔ میں کیا دیا کر سکتا ہوں۔ لیکن تم مجھے بتاؤ کہ میں کیا سیوا کر سکتا ہوں۔

بیٹا مجھے اپنی جوان بیٹی کا بیاہ کرنا ہے تم اگر میری کچھ مدد کرسکو تو میں ساری عمر تمہیں دعائیں دوں گی۔

بجلی نے اس عورت سے پوچھا۔ کتنے روپوں میں کام چل جائے گا۔

عورت نے کہا۔ بیٹا تم خود ہی سمجھ لو ——— میں ایک بھکارن بن کر تمہارے پاس آئی ہوں۔

بجلی نے کہا بھکارن منہ سے کہو ——— میرا فرض ہے کہ تمہاری مدد کروں اس کے بعد اس نے بزاز سے جو تھان تہہ کر رہا تھا۔ کہا لالہ جی ——— دو ہزار روپے نکالئے۔

لالہ جی نے دو ہزار روپے فوراً صندوقچی سے نکالے اور گن کر بجلی پہلوان

کو دے دیئے یہ روپے اس نے اس عورت کو پیش کر دیئے ماتا ——— بھگوان کرے تمہاری بیٹی کے بھاگ اچھے ہوں۔ وہ عورت چند لمحات کے لئے نوٹ ہاتھ میں لئے بت بنی کھڑی رہی۔ غالباً اس کو اتنے روپے ایک دم مل جانے کی توقع ہی نہیں تھی۔ جب وہ سنبھلی تو اس نے بجلی پہلوان پر دعاؤں کی بوچھاڑ کر دی۔

میں نے دیکھا کہ پہلوان بڑی اُلجھن محسوس کر رہا تھا۔ آخر اس نے اس عورت سے کہا۔

ماتا مجھے شرمندہ نہ کرو۔ جاؤ اپنی بیٹی کے دان دہیز کا انتظام کرو۔ اس کو میرا آشیرباد دینا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کس قسم کا غنڈہ اور بدمعاش ہے جو ——— ایک ایسی عورت کو جو مسلمان ہے اور جسے وہ جانتا بھی نہیں دو ہزار روپے پکڑا دیتا ہے لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ بڑا مخیر ہے ہر مہینے ہزاروں روپے دان کے طور پر دیتا ہے۔ مجھے چونکہ اس کی شخصیت سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس لئے میں نے کافی چھان بین کے بعد بجلی پہلوان کے متعلق کئی معلومات حاصل کیں۔ مغل بازار میں اکثر دکانیں اسی کی تھیں۔ حلوائی کی دکان بزاز کی دکان ہے شربت بیچنے والا ہے شیشے فروخت کرنے والا ہے پنساری ہے غرضیکہ اس سرے سے اس سرے تک جہاں وہ بزاز کی دکان میں بیٹھتا تھا۔ اس نے ایک لائن

آف کمیونیکیشن قائم کر رکھی تھی ۔ تاکہ اگر پولیس چھاپہ مارنے کی غرض سے آئے تو اُسے فوراً اطلاع مل جائے دراصل اس کی دو بیٹھکوں میں جو بزاز کی دکان کے بالکل سامنے تھیں بہت بھاری جوا ہوتا تھا ۔ ہر روز ہزاروں روپے فال کی صورت میں اُسے وصول ہو جاتے تھے ۔ وہ خود جوا نہیں کھیلتا تھا نہ شراب پیتا تھا مگر اس کی بیٹھکوں میں شراب ہر وقت مل سکتی تھی اس سے بھی اس کی آمدن کافی تھی ۔ شہر کے جتنے بڑے بڑے غنڈے تھے ان کا اس نے ہفتہ مقرر کر رکھا تھا ۔ یعنی ہفتہ وار انہیں ان کے مرتبے کے مطابق تنخواہ مل جاتی تھی میرا خیال ہے ۔ اس نے یہ سلسلہ بطور حفظِ ماتقدم شروع کیا تھا کہ وہ غنڈے بڑی خطرناک قسم کے تھے ۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کہ یہ غنڈے سب کے سب مسلمان تھے زیادہ تر ہاتھی دروازے کے ۔ ہر ہفتے بجلی پہلوان کے پاس جاتے اور اپنی تنخواہ وصول کر لیتے ______ وہ ان کو کبھی ناامید نہ لوٹاتا ۔ اس لئے کہ اس کے پاس روپیہ عام تھا میں نے سنا کہ ایک دن وہ بزاز کی دُکان پر حسبِ معمول بیٹھا تھا ۔ کہ ایک ہندو بنیا جو کافی مالدار تھا اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی پہلوان جی میرا لڑکا خراب ہو گیا ہے ______ اس کو ٹھیک کر دیجئے ۔ پہلوان نے مسکرا کر اس سے کہا میرے دو لڑکے ہیں ______ بہت شریف ۔ لوگ مجھے غنڈہ اور بدمعاش کہتے ہیں لیکن میں نے انہیں

اس طرح پالا پوسا ہے کہ وہ بُری حرکت کر ہی نہیں سکتے ۔ مہاشہ جی یہ آپ کا قصور ہے آپ کے لڑکے کا نہیں ۔

بنیئے نے ہاتھ جوڑ کر کہا پہلوان جی ______ میں نے بھی اس کو اچھی طرح پالا پوسا ہے پر اس نے اب چوری چوری بہت بُرے کام شروع کر دیئے ہیں ۔ بجلی نے اپنا فیصلہ سُنا دیا اس کی شادی کر دو ۔

اس واقعے کو دس روز گزرے تھے کہ بجلی پہلوان ایک نوجوان لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گیا ۔ حالانکہ اس سے اس قسم کی توقع نہیں ہو سکتی تھی ۔ لڑکی کی عمر سولہ سترہ برس کے لگ بھگ ہو گی اور بجلی پچاس سے اُوپر ہو گا ۔ آدمی بااثر اور مالدار تھا لڑکی کے والدین راضی ہو گئے چنانچہ شادی ہو گئی ۔ اس نے شہر کے باہر ایک عالی شان کوٹھی بنائی تھی دولہن کو جب وہ اس میں لے کر گیا ۔ تو اُسے ایسا محسوس ہوا کہ تمام جھاڑ اور فانوس ماند پڑ گئے ہیں ۔ لڑکی بہت خوبصورت تھی ۔ پہلی رات بجلی پہلوان نے کسرت کرنا چاہی مگر نہ کر سکا ۔ اس لئے اس کے دماغ میں اپنی بیوی کا خیال کروٹیں لے رہا تھا اس کے دو جوان لڑکے تھے جو اسی کوٹھی کے کسی کمرے میں سو رہے تھے یا جاگ رہے تھے اس نے اپنی پہلی بیوی کو کہیں باہر بھیج دیا تھا اس کو اس کا قطعاً علم نہیں تھا کہ اس کے پتی نے دوسری شادی کر لی ہے ______ بجلی پہلوان سوچتا تھا کہ اسے اور کچھ نہیں تو اپنی پہلی استری کو مطلع ضرور کر دینا چاہئے تھا ۔

ساری رات نئی نویلی دُلہن جس کی عمر سولہ سترہ برس کے قریب تھی چوڑے چکلے پلنگ پر بیٹھی بجلی پہلوان کی اوٹ پٹانگ باتیں سنتی رہی اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ شادی کیا ہے کیا اُسے ہر روز اسی قسم کی باتیں سُننا ہوں گی۔

کل میں تمہارے لئے دس ہزار کے زیور اور لاؤں گا۔

تم بڑی سُندر ہو۔

برقی کھاؤ گی یا پیڑے۔

یہ سارا شہر سمجھو کہ تمہارا ہے۔

یہ کوٹھی میں تمہارے نام لکھ دوں گا۔

کتنے نوکر چاہئیں تمہیں ——— مجھے بتا دو۔ ایک منٹ میں انتظام ہو جائے گا۔

میرے دو جوان لڑکے ہیں بہت شریف ——— تم اُن سے جو کام لینا چاہو لے سکتی ہو وہ تمہارا حکم مانیں گے۔ دُلہن ہر روز اسی قسم کی باتیں سنتی رہی۔

حتیٰ کہ چھ مہینے گذر گئے۔ بجلی پہلوان دن بدن اس کی محبت میں غرق ہوتا گیا وہ اس کے تیکھے نقش دیکھتا تو اپنی ساری پہلوانی بھول جاتا۔

اس کی پہلی بیوی بدشکل تھی۔ ان معنوں میں کہ اس میں کوئی کشش نہیں تھی وہ

ایک عام کھترانی تھی جو ایک بچہ جننے کے بعد بوڑھی ہو جاتی ہے لیکن اس کی یہ دوسری بیوی بڑی ٹھوس تھی دس بچے پیدا کرنے کے بعد بھی وہ ثابت وسالم رہ سکتی تھی۔ بجلی پہلوان کا ایک وید دوست تھا اس کے پاس وہ کئی دنوں سے جا رہا تھا۔

اس نے بجلی پہلوان کو یقین دلایا کہ اب کسی قسم کے تردد کی ضرورت نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پہلوان خوش تھا۔ وید کے ہاں سے آتے ہوئے اس نے کئی اسکیمیں تیار کیں۔ راستے میں مٹھائی خریدی۔ سونے کے دو بڑے بڑے خوشنما کڑے لئے۔

بارہ قمیضوں اور بارہ شلواروں کے لئے بہترین کپڑا قیمت ادا کئے بغیر حاصل کیا۔ اس لئے کہ وہ لوگ جو دکان کے مالک تھے اس سے مرعوب تھے اور قیمت لینے سے انکاری تھے۔ شام کو سات بجے وہ گھر پہنچا۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے اپنے کمرے میں گیا۔ دیکھا تو وہاں اس کی دوسری بیوی نہیں تھی اس نے سوچا۔ شاید غسل خانے میں ہوگی۔ چنانچہ اس نے اپنا بوجھ میرا مطلب ہے وہ تھان وغیرہ پلنگ پر رکھ کر غسل خانے کا رُخ کیا۔ مگر وہ خالی تھا۔

بجلی پہلوان بڑا متحیر ہوا کہ اس کی بیوی کہاں گئی۔ طرح طرح کے خیالات اس کے دماغ میں آئے مگر وہ کوئی نتیجہ برآمد نہ کر سکا۔ اس نے وید کی دی ہوئی گولیاں کھائیں اور پلنگ پر بیٹھ گیا کہ اس کی بیوی آ جائے

گی - آخر اُسے جانا کہاں ہے؟

وہ گولیاں کھا کر پلنگ پر بیٹھا قمیضوں کے کپڑوں کو انگلیوں میں مسل مسل کر دیکھ رہا تھا کہ اسے اپنی بیوی کی ہنسی کی آواز سنائی دی - وہ چونکا اُٹھ کر اُس کمرے میں گیا جو اس نے اپنے بڑے لڑکے کو دے رکھا تھا - اندر سے اس کی بیوی اور اس کے بیٹے کی ہنسی کی آواز نکل رہی تھی -

اس نے دستک دی - لیکن دروازہ نہ کھلا - پھر بڑے زور سے چلانا شروع کیا کہ دروازہ کھولو - اس وقت اس کا خون کھول رہا تھا - دروازہ پھر بھی نہ کھلا -

اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے کمرے کے اندر اس کی بیوی اور اُس کے بڑے لڑکے نے سانس لینا بھی بند کر دیا ہے -

بجلی پہلوان نے بڑے کمرے میں جا کر گورکھی زبان میں ایک رُقعہ لکھا جس کی عبارت اُردو میں کچھ یوں ہو سکتی ہے -

یہ کوٹھی اب تمہاری ہے ——— میری بیوی بھی اب تمہاری بیوی ہے ——— تمہارے لئے کچھ تحفے لایا تھا وہ یہاں چھوڑے جا رہا ہوں -

یہ رقعہ لکھ کر اس نے ساٹن کے تھان کے ساتھ ٹانک دیا -

(۲۷ مئی ۱۹۵۴ء)

ایک زاہدہ ایک فاحشہ

جاوید مسعود سے میرا اتنا گہرا دوستانہ تھا کہ میں ایک قدم بھی اس کی مرضی کے خلاف اٹھا نہیں سکتا تھا وہ مجھ پر نثار تھا میں اس پر ہم ہر روز قریب قریب دس بارہ گھنٹے ساتھ رہتے وہ اپنے رشتہ داروں سے خوش نہیں تھا اس لئے جب بھی وہ بات کرتا تو کبھی اپنے بڑے بھائی کی برائی کرتا اور کہتا سنگ باش برادر خورد مباش اور کبھی کبھی گھنٹوں خاموش رہتا جیسے خلا میں دیکھ رہا ہے میں اس کے ان لمحات سے تنگ آ کر جب زور سے پکارتا -

جاوید یہ کیا بے ہودگی ہے - وہ ایک دم چونکتا اور معذرت طلب کرتا ——— سعادت بھائی معاف کرنا ———

اچھا تو پھر کیا ہوا وہ اس وقت بالکل خالی الذہن ہوتا ——— میں

کہتا بھئی جاوید دیکھو ——— مجھے تمہارا یہ وقتاً فوقتاً معلوم نہیں
کن گہرائیوں میں کھو جانا بالکل پسند نہیں ——— مجھے تو ڈر لگتا
ہے ایک دن تم پاگل ہو جاؤ گے ——— یہ سن کر جاوید بہت ہنسا
پاگل ہونا بہت مشکل ہے سعادت ——— لیکن آہستہ آہستہ
اس کا خلا میں دیکھنا بڑھتا گیا ——— اور اس کی خاموشی طویل سکوت
میں تبدیل ہو گئی ۔ اور وہ پیاری سی مسکراہٹ جو اس کے ہونٹوں پر ہر وقت
کھیلتی رہتی تھی بالکل پھیکی پڑ گئی ۔

میں نے ایک دن اس سے پوچھا آخر بات کیا ہے تم تجسمہ بن گئے ہو ——
ہوا کیا تمہیں ؟ ——— میں تمہارا دوست ہوں خدا کے لئے مجھ
سے تو اپنا راز نہ چھپاؤ ۔ جاوید خاموش رہا جب میں نے اس کو بہت لعن طعن
کی تو اس نے اپنی زبان کھولی میں کالج سے فارغ ہو کر ڈیڑھ بجے کے قریب
آؤں گا ۔ اُس وقت تمہیں جو پوچھنا ہو گا ۔ بتا دوں گا ۔ وعدے کے مطابق
وہ ٹھیک ڈیڑھ بجے میرے یہاں آیا ۔ وہ مجھ سے چار سال چھوٹا تھا ۔ بے حد
خوبصورت ۔ اس میں نسوانیت کی جھلک تھی پڑھائی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں
تھی اس لئے میں آوارہ گرد تھا لیکن وہ باقاعدگی کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہا تھا
میں اس کو اپنے کمرے میں لے گیا جب میں نے اس کو سگرٹ پیش کیا تو اُس
نے ہونے کہا کیا تم میرے روگ کے متعلق پوچھنا چاہتے تھے ؟ میں نے کہا

مجھے معلوم نہیں ——— روگ ہے یا سوگ بہرحال تم تو اصل حالت
میں نہیں ہو ——— تمہیں کوئی نہ کوئی ذہنی تکلیف ضرور ہے وہ مسکرایا ہے
اس لئے کہ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے ۔

محبت ——— میں بوکھلا گیا ——— جاوید کی عمر بمشکل
اٹھارہ برس کی ہو گی ۔ وہ خود ایک خوبرو لڑکی کی مانند اس کو کس لڑکی سے
محبت ہو سکتی ہے یا ہو گئی ہے وہ تو کنواری لڑکیوں سے کہیں زیادہ شرمیلا اور
لچکیلا تھا وہ مجھ سے باتیں کرتا تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ وہ دیہاتی دوشیزہ
ہے جس نے پہلی دفعہ کوئی عشقیہ فلم دیکھا ہے ۔ آج مجھ سے کہہ رہا تھا کہ مجھے
ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے ۔ میں نے پہلے سمجھا شاید مذاق کر رہا
ہے ۔

مگر اس کا چہرہ بہت سنجیدہ تھا ایسا لگتا تھا کہ فکر کی اتھاہ گہرائیوں میں
ڈوبا ہوا ہے آخر میں نے اس سے پوچھا کس لڑکی سے محبت ہوئی ہے
تمہیں ؟

اس نے کوئی جھینپ محسوس نہ کی ایک لڑکی ہے زاہدہ ———
ہمارے پڑوس میں رہتی ہے بس اس سے محبت ہو گئی ہے عمر سولہ برس کے
قریب ہے بہت خوبصورت ہے اور بھولی بھالی ——— چوری
چھپے اس سے کئی ملاقاتیں ہو چکی ہیں اُس نے میری محبت قبول کر لی ہے

میں نے اس سے پوچھا تو پھر اس اُداسی کا مطلب کیا ہے جو تم پر ہر وقت چھائی رہتی ہے اس نے مسکرا کر کہا۔

سعادت تم نے کبھی محبت کی ہو تو جانو ـــــــ محبت اُداسی کا دوسرا نام ہے ہر وقت آدمی کھویا کھویا سا رہتا ہے اس لئے کہ اس کے دل و دماغ میں صرف خیالِ یار ہوتا ہے ـــــــ میں نے زاہدہ سے تمہارا ذکر کیا اور اس سے کہا کہ تمہارے بعد اگر کوئی ہستی مجھے عزیز ہے تو وہ میرا دوست سعادت ہے۔ یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔

بس میں نے کہہ دیا ـــــــ اور زاہدہ نے بڑا اشتیاق ظاہر کیا کہ میں تمہیں اس سے ملاؤں اُسے میری وہ چیز پسند ہے جسے میں پسند کرتا ہوں ـــــــ بولو چلو گے اپنی بھابی کو دیکھنے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس سے کیا کہوں اس کے پتلے پتلے نازک ہونٹوں پر لفظ بھابی سجتا نہیں تھا۔

میری بات کا جواب دو۔

میں نے سرسری طور پر کہہ دیا چلیں گے ـــــــ ضرور چلیں گے پر کہاں؟

اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ کل شام کو پانچ بجے کسی بہانے سے لارنس گارڈن آئے گی ـــــــ آپ اپنے دوست کو ضرور ساتھ لایئے گا ـــــــ اب تم کل ضرور تیار رہنا ـــــــ بلکہ خود ہی پانچ بجے سے پہلے پہلے وہاں پہنچ جانا۔ ہم جم خانہ کلب کے اس طرف لان میں تمہارا انتظار کرتے ہوں گے میں انکار کیسے کرتا اس لئے کہ مجھے جاوید سے بے حد پیار تھا میں نے وعدہ کر لیا لیکن مجھے اس پر کچھ ترس آ رہا تھا۔

میں نے اس سے اچانک پوچھا۔

لڑکی شریف اور پاکباز ہے نا؟ جاوید کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا۔

میں زاہدہ کے بارے میں ایسی باتیں نہ سوچ سکتا ہوں نہ سن سکتا ہوں تمہیں اگر اس سے ملنا ہے تو ٹھیک پانچ بجے کل شام لارنس گارڈن پہنچ جانا۔ خدا حافظ۔

جب وہ ایک دم اٹھ کر چلا گیا تو میں نے سوچنا شروع کیا۔ مجھے بڑی ندامت محسوس ہوئی کہ میں نے اس سے ایسا سوال کیوں کیا۔ جس سے اُس کے جذبات مجروح ہوئے۔

آخر وہ اس سے محبت کرتا تھا اگر کوئی لڑکی کسی سے محبت کرے تو ضروری نہیں کہ وہ بدکردار ہو۔ جاوید مجھے اپنا مخلص ترین دوست تسلیم کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ناراضی کے باوجود مجھ سے برہم نہ ہوا اور مجھ کو جاتے ہوئے کہہ گیا کہ وہ شام کو لارنس گارڈنز آئے میں سوچتا تھا کہ زاہدہ سے مل کر میں اُس سے کس قسم کی باتیں کروں گا۔

بے شمار باتیں میرے ذہن میں آئیں ۔ لیکن وہ اس قابل نہیں تھیں کہ کسی دوست کی محبوبہ سے کی جائیں ۔ میرے متعلق خدا معلوم وہ اس سے کیا کچھ کہہ چکا تھا۔ یقیناً اس نے مجھ سے اپنی محبت کا اظہار بڑے والہانہ طور پر کیا ہو گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زاہدہ کے دل میں میری طرف سے حسد پیدا ہو گیا ہو ۔ کیونکہ عورتیں اپنے عاشقوں کی محبت بٹتے نہیں دیکھ سکتیں۔ شاید میرا مذاق اڑانے کے لیے اس نے جاوید سے کہا ہو کہ تم مجھے اپنے پیارے دوستوں سے ضرور ملاؤ بہر حال مجھے اپنے عزیز ترین دوست کی محبوبہ سے ملنا تھا ———

اس تقریب پر میں نے سوچا کوئی تحفہ تو لے جانا چاہیے۔ رات بھر غور کرتا رہا آخر ایک تحفہ سمجھ میں آیا کہ سونے کے ٹاپس ٹھیک رہیں گے۔ انار کلی میں گیا تو سب دکانیں بند۔ معلوم ہوا کہ اتوار کی تعطیل ہے ——— لیکن ایک جوہری کی دکان کھلی تھی۔ اس سے ٹاپس خریدے اور واپس گھر آیا۔ چار بجے تک شش و پنج میں مبتلا رہا کہ جاؤں یا نہ جاؤں ۔ مجھے کچھ حجاب سا محسوس ہوتا ہے ——— لڑکیوں سے بے تکلف باتیں کرنے کا عادی نہیں تھا اس لئے مجھ پر گھبراہٹ کا عالم طاری تھا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں نے کچھ دیر سونا چاہا۔ مگر کروٹیں بدلتا رہا۔ ٹاپس میرے تکیے کے نیچے پڑے تھے ایسا لگتا تھا کہ دو دہکتے ہوئے انگارے ہیں ——— اٹھا ——— غسل کیا اس کے بعد شیو ———

پھر نہایا اور کپڑے بدل کر بڑے کمرے میں کلاک کی ٹک ٹک سننے لگا۔

تین بج چکے تھے ۔ اخبار اٹھایا ——— مگر اس کی ایک خبر نہ پڑھ سکا ——— عجب مصیبت تھی ——— عشق میرا دوست کر رہا تھا اور میں ایک قسم کا مجنون بن گیا تھا میرا بہترین سوٹ ریشمین کا سلا ہوا میرے بدن پر تھا رومال نیا شو بھی نئے ——— میں نے یہ سنگھار اس لئے کیا تھا کہ جاوید نے جو تعریف کے پل زاہدہ کے سامنے باندھے ہیں کہیں ٹوٹ نہ جائیں ۔ ساڑھے چار بجے میں اٹھا ۔ اپنی ریلے کی بہترین سائیکل لی اور آہستہ آہستہ لارنس گارڈن روانہ ہو گیا ۔

جم خانہ کلب کے اس طرف لان میں مجھے جاوید دکھائی دیا ۔ وہ اکیلا تھا اس نے زور کا نعرہ بلند کیا ۔ میں جب سائیکل پر سے اترا تو وہ میرے ساتھ چمٹ گیا کہنے لگا۔

تم پہلے ہی پہنچ گئے ۔ بہت اچھا کیا۔ زاہدہ اب آتی ہی ہو گی ——— میں نے تو اس سے کہا تھا کہ میں اپنی کار بھیج دوں گا۔ مگر وہ رضامند نہ ہوئی ۔ تانگے میں آئے گی ۔

جاوید کے باپ کی ایک کار تھی ۔ بے بی آسٹن ۔ خدا معلوم کس صدی کا ماڈل تھا ۔ زیادہ تر یہ جاوید ہی کے استعمال میں آتی تھی ۔ لارنس گارڈنز میں داخل ہوتے وقت یہ عجوبۂ روزگار موٹر دیکھ لی تھی میں نے اس سے کہا آ ڈ"

بیٹھ جائیں لیکن وہ رضامند نہ ہوا۔ مجھ سے کہنے لگا۔ تم ایسا کرو —— باہر گیٹ پر جاؤ —— ایک تانگہ آئے گا جس میں ایک دُبلی پتلی لڑکی سیاہ بُرقع پہنے ہوگی۔ تم تانگے والے کو ٹھہرا لینا اور اس سے کہنا۔ میں جاوید کا دوست سعادت ہوں —— اس نے مجھے تمہارے استقبال کے لیے بھیجا ہے۔

نہیں جاوید —— مجھ میں اتنی جرأت نہیں۔

لاحول ولا —— —— جب تم نام بتا دو گے تو اُسے چوں کرنے کی بھی جرأت نہیں ہوگی۔ تمہاری جرأت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے یار زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسی چیز ہونی چاہئے۔ جسے بعد میں یاد کر کے آدمی محظوظ ہو سکے۔

جب زاہدہ سے میری شادی ہو جائے گی تو ہم آج کے اس واقعے کو یاد کر کے خوب ہنسا کریں گے —— جاؤ میرے بھائی —— وہ بس اب آتی ہی ہوگی۔

میں جاوید کا کہنا کیسے موڑ سکتا تھا۔ بادل ناخواستہ چلا گیا اور گیٹ سے کچھ دور کھڑا ہو کر اس تانگے کا انتظار کرنے لگا۔ جس میں زاہدہ اکیلی کالے بُرقعے میں ہو۔

آدھے گھنٹے کے بعد ایک تانگہ اندر داخل ہوا۔ جس میں ایک لڑکی

کالے ریشمی برقعے میں ملبوس پچھلی نشست پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھی تھی۔

میں جھجکتا سٹپٹاتا ڈرتا آگے بڑھا اور تانگے والے کو روکا۔ اُس نے فوراً اپنا تانگہ روک لیا۔

میں نے اس سے کہا یہ سواری کہاں سے آئی ہے؟ تانگے والے نے ذرا سختی سے جواب دیا۔

تمہیں اس سے کیا مطلب —— جاؤ اپنا کام کرو۔

برقع پوش لڑکی نے مہین سی آواز میں تانگے والے کو ڈانٹا تم شریف آدمیوں سے بات کرنا بھی نہیں جانتے —— پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی آپ نے تانگہ کیوں روکا تھا جناب —— میں نے ہکلا کے جواب دیا۔ جاوید —— جاوید —— میں جاوید کا دوست سعادت ہوں۔

آپ کا نام زاہدہ ہے نا اس نے بڑی نرمی سے جواب دیا۔

جی ہاں —— میں آپ کے متعلق اُن سے بہت سی باتیں سن چکی ہوں۔

اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ سے اسی طرح ملوں اور دیکھوں کہ آپ مجھ سے کس طرح پیش آتی ہیں —— وہ اُدھر جم خانہ کلب کے پاس گھاس کے تختے پر بیٹھا آپ کا انتظار کر رہا ہے۔

اس نے اپنی نقاب اُٹھائی اچھی خاصی شکل صورت تھی مسکرا کر مجھ سے کہا

آپ اگلی نشست پر بیٹھ جایئے ——— مجھے ایک ضروری کام ہے ——— ابھی چند منٹوں میں لوٹ آئیں گے آپ کے دوست کو زیادہ دیر تک گھاس پر نہیں بیٹھنا پڑے گا۔ میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اگلی نشست پر کوچوان کے ساتھ بیٹھ گیا تانگہ اسمبلی ہال کے پاس سے گذرا تو میں نے تانگے والے سے کہا بھائی صاحب یہاں کوئی سگرٹ والے کی دکان ہو تو ذرا دیر کے لیے ٹھہر جانا میرے سگرٹ ختم ہو گئے ہیں۔ ذرا آگے بڑھے تو سڑک پر ایک سگرٹ پان والا بیٹھا تھا۔ تانگے والے نے اپنا تانگہ روکا۔ میں اُترا تو زاہدہ نے کہا۔

آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں یہ تانگے والا لے آئے گا۔

میں نے کہا۔

اس میں تکلیف کی کیا بات ہے اور اس پان والے کے پاس پہنچ گیا ایک ڈبیہ گولڈ فلیک کی لی۔

ایک ماچس اور دو پان جب پانچ کے نوٹ سے باقی پیسے لے کر مڑا تو کوچوان میرے پیچھے کھڑا تھا۔

اس نے دبی آواز میں مجھ سے کہا۔

حضور اس عورت سے بچ کر رہیے گا۔

میں بڑا حیران ہوا کیوں۔

کوچوان نے بڑے وثوق سے کہا۔

فاحشہ ہے ——— اس کا کام یہی ہے کہ شریف اور نوجوان لڑکوں کو پھانستی ہے۔ میرے تانگے میں اکثر بیٹھتی ہے یہ سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔

میں نے تانگے والے سے کہا۔

خدا کے لیے تم اُسے وہیں چھوڑ آؤ جہاں سے لائے ہو ——— کہہ دینا کہ میں اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتا۔ اس لئے کہ میرا دوست وہاں لارنس گارڈنز میں انتظار کر رہا ہے۔

تانگے والا چلا گیا ——— معلوم نہیں اس نے زاہدہ سے کیا کہا۔

میں نے ایک دوسرا تانگہ لیا اور سیدھا لارنس گارڈنز پہنچا۔ دیکھا کہ جاوید ایک خوبصورت لڑکی سے محو گفتگو ہے بڑی شرمیلی اور سجیلی تھی۔

میں جب پاس آیا تو اس نے فوراً اپنے دوپٹہ سے منہ چھپا لیا۔

جاوید نے بڑی خفگی آمیز لہجے میں مجھ سے کہا۔

تم کہاں غارت ہو گئے تھے ——— تمہاری بھابی کب کی آئی بیٹھی ہیں۔ سمجھ میں نہ آیا کیا کہوں سخت بوکھلا گیا ——— اس بوکھلاہٹ میں یہ کہہ گیا تو وہ کون تھیں جو مجھے تانگے میں ملیں؟

جاوید نہسا مذاق نہ کرو مجھ سے ———— بیٹھ جاؤ اور اپنی بھابی سے باتیں کرو۔ یہ تم سے ملنے کی بہت مشتاق تھیں ہیں۔ بیٹھ گیا اور کوئی سلیقے کی بات نہ کر سکا اس لئے کہ میرے دل و دماغ پر وہ لڑکی یا عورت مسلط ہو گئی تھی جس کے متعلق تانگے والے نے مجھے بڑے خلوص سے بتا دیا تھا کہ فاحشہ ہے۔

(۲۸ر مئی ۵۴ء)

شیدا

شیدے کے متعلق امرتسر میں یہ مشہور تھا کہ وہ چٹان سے بھی ٹکر لے سکتا ہے۔ اُس میں بلا کی پھُرتی اور طاقت تھی گو تن و توش کے لحاظ سے وہ ایک کمزور انسان دکھائی دیتا تھا۔ لیکن امرتسر کے سارے غنڈے اس سے خوف کھاتے اور اس کو احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ فرید کا چوک معلوم نہیں فسادات کے بعد اس کی کیا حالت ہے عجیب و غریب جگہ تھی۔ یہاں شاعر بھی تھے۔ ڈاکٹر اور حکیم بھی موچی اور جُلاہے جواری اور بدمعاش نیک اور پرہیز گار سبھی یہاں بستے تھے۔ ہر وقت گھما گھمی رہتی تھی۔

شیدے کی سرگرمیاں چوک سے باہر ہوتی تھیں یعنی وہ اپنے علاقے میں کوئی ایسی حرکت نہیں کرتا تھا۔ جس پر اس کے محلے والوں کو اعتراض ہو اس نے جتنی لڑائیاں لڑیں دوسرے غنڈوں کے محلے میں۔

وہ کہا کرتا تھا - اپنے محلے میں کسی دوسرے محلے کے غنڈے سے لڑنا نامردی کی نشانی ہے ——— مزا تو یہ ہے کہ دشمن کو اس کی اپنی جگہ پر مارا جائے اور یہ سچ تھا - ایک بار پٹڑنگوں سے اس کی ٹھن گئی - وہ کئی مرتبہ چوک قریب سے گذرے ——— بڑھکیں مارتے نعرے لگاتے شیدے کو گالیاں دیتے - وہ سب سن رہا تھا - مگر اس نے اُن سے بھڑنا مناسب نہ سمجھا اور خاموش رحمان تاندر کی دکان میں بیٹھا رہا -

لیکن دو گھنٹوں کے بعد وہ پٹڑنگوں کے محلے کی طرف روانہ ہوا - اکیلا بالکل اکیلا اور بغیر غیر مسلح ——— وہاں جا کر اس نے ایک فلک شگاف نعرہ بلند کیا اور پٹڑنگوں کو جو اپنے کام میں مصروف تھے للکارا نکلو باہر ——— تمہاری ——— دس پندرہ پٹڑنگ لاٹھیاں لے کر باہر نکل آئے اور جنگ شروع ہو گئی میرا خیال ہے شیدا گتکے اور بنوٹ کا ماہر تھا - اُس پر لاٹھیاں برسائی گئیں -

لیکن اس نے ایک بھی ضرب اپنے پر نہ لگنے دی - ایسے پینترے بدلتا رہا کہ پٹڑنگوں کی مت گم ہو گئی - آخر اس نے ایک پٹڑنگ سے بڑی چابکدستی سے لاٹھی چھینی اور حملہ آوروں کو مار مار کے ادھ موا کر دیا - دوسرے روز اُسے گرفتار کر لیا گیا ——— دو برس قید بامشقت کی سزا ہوئی -

وہ جیل چلا گیا جیسے وہ اس کا اپنا گھر ہے اس دوران میں ابو کی بوڑھی ماں وقتاً فوقتاً

ملاقات کے لیے آتی رہی - وہ مشقت کرتا تھا لیکن اُسے کوئی کوفت نہیں ہوتی تھی وہ سوچتا تھا کہ چلو ورزش ہو رہی ہے صحت ٹھیک رہے گی - اس کی صحت باوجود اس کے کہ کھانا بڑا واہیات ہوتا تھا - پہلے سے بہتر تھی اُس کا وزن بڑھ گیا تھا لیکن وہ بعض اوقات مغموم ہو جاتا اور اپنی کوٹھڑی میں ساری رات جاگتا رہتا اُس کے ہونٹوں پہ پنجابی کی یہ بولی ہوتی سے

کی کیجئے تیری یاری
مہتاں مہتاں ہو کے ٹٹ گئی

ایک برس گذر گیا - مشقت کرتے کرتے ——— اب اُس کی افسردگی کا دور شروع ہوا - اس نے مختلف بولیاں گانا شروع کر دیں -

مجھے ایک قیدی نے بتایا جو اس کے ساتھ والی کوٹھڑی میں تھا کہ وہ بولیاں یہ گایا کرتا تھا سے

لبھ جان گے یار گواچے
ٹھیکے لے لے پتناں دے

اس کا مطلب یہ ہے کہ تجھے اپنا گم شدہ محبوب مل جائے گا اگر تو دریا کے ساحل پر کشتیاں چلانے کا ٹھیکہ لے لے سے

گڈی کٹ جاندی جھنجھاں دی پریم والی
منڈے نے جاندے اونہاں دی ڈور لٹے

یعنی جن کی محبت کا پتنگ کٹ جاتا ہے تو ڈورکے بالے بڑا شور مچاتے ہیں اور اُن کی ڈور لوٹ کر لے جاتے ہیں۔ میں اب اور بولیوں کا ذکر نہیں کروں گا۔ کیونکہ ان سب کا جو شیدے کے ہونٹوں پر ہوتی تھیں ایک ہی قسم کا مفہوم ہے۔

اس قیدی نے مجھ سے کہا۔

ہم سمجھ گئے تھے کہ شیدا کس کے عشق میں گرفتار ہے ———— کیونکہ ہم نے کئی مرتبہ اُسے آہیں بھرتے بھی دیکھا۔ مشقت کے دوران وہ بالکل خاموش رہتا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ کسی اور دنیا کی سیر کر رہا ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ایک لمبی آہ بھرتا اور پھر اپنے خیالات میں کھو جاتا۔

ڈیڑھ برس کے بعد جب شیدا خودکشی کا ارادہ کر چکا تھا اور کوئی ایسی ترکیب سوچ رہا تھا کہ اپنی زندگی ختم کر دے کہ اُسے اطلاع ملی کہ ایک جوان لڑکی تم سے ملنے آئی ہے۔

اس کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ جوان لڑکی کون ہو سکتی ہے اس کی تو صرف ماں ہی ماں تھی جو اس سے اپنی ممتا کے باعث ملنے آ جایا کرتی تھی۔

ملاقات کا انتظام ہوا۔ شیدا سلاخوں کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ مسلح سپاہی۔

لڑکی کو بلایا گیا۔ شیدے نے سلاخوں میں سے دیکھا کہ برقع پوش عورت آہنی پنجرے کی طرف بڑھ رہی ہے اس کو ابھی تک یہ حیرت تھی ———— کہ یہ عورت یا لڑکی کون ہو سکتی ہے۔ سفید برقع تھا۔ جب وہ پاس آئی تو اس نے نقاب اٹھائی۔

شیدا چیخا تم ———— تم کیسے۔ زلیخا جو کہ ٹیڑھنگوں کی لڑکی تھی زار و قطار رونے لگی۔ اس کے حلق میں لفظ اٹک اٹک گئے میں تم سے ملنے آئی ہوں۔ لیکن ———— لیکن مجھے ———— مجھے معاف کر دینا اتنی دیر کے بعد آئی ہوں ———— تم ———— خدا معلوم ———— اپنے دل میں میرے متعلق کیا سوچتے ہو گے۔

شیدے نے سلاخوں کے ساتھ سر لگا کر کہا۔

نہیں میری جان ———— میں تمہارے متعلق سوچتا ضرور رہا ———— لیکن جانتا تھا کہ تم مجبور ہو ———

زلیخا نے روتے ہوئے کہا۔

میں واقعی مجبور تھی ———— لیکن آج مجھے موقع ملا تو میں آ گئی۔ سچ کہتی ہوں میرا دل کسی چیز میں نہیں لگتا تھا ————

یہ موقع تمہیں کیسے مل گیا؟

زلیخا کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ میرے ابا کا انتقال ہو گیا ہے۔ کل ان کا چالیسواں تھا۔

شیدا مرحوم سے اپنی مخاصمت بھول گیا۔ خدا انہیں جنت بخشے ——
مجھے یہ خبر سن کر بڑا افسوس ہوا یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

صبر کرو زلیخا —— اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ۔ زلیخا نے اپنے سفید برقعے سے آنسو پونچھے میں نے بہت صبر کیا ہے۔ شیدے اب اور کتنی دیر کرنا پڑے گا۔

تم یہاں سے کب نکلو گے ؟ بس چھ مہینے رہ گئے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے بہت پہلے ہی چھوڑ دیں گے ۔ یہاں کے سب افسر مجھ پر مہربان ہیں ۔
زلیخا کی آواز میں محبت کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو گیا جلدی آؤ پیارے ——
مجھے اب تمہاری ہونے سے روکنے والا کوئی نہیں —— خدا کی قسم اگر کسی نے تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو میں خود اس سے نپٹ لوں گی ——

میں نہیں چاہتی کہ تم پھر اسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ۔

سنتری نے کہا۔

وقت ختم ہو گیا۔ چنانچہ ان کی ملاقات بھی ختم ہو گئی۔ زلیخا روتی روتی چلی گئی۔ اور شیدا دل میں مسرت اور آنکھ میں آنسو لیے جیل کے اندر چلا گیا۔ جہاں اس کو مشقت کرنا تھی اس دن اس نے اتنا کام کیا کہ جیلر دنگ رہ گیا۔ دو مہینوں کے بعد اسے رہا کر دیا گیا —— اس دوران میں زلیخا دو مرتبہ اس سے ملاقات کرنے آئی تھی —— اس نے آخری ملاقات میں

اس کو بتا دیا تھا کہ وہ کس تاریخ کو جیل سے باہر نکلے گا۔

چنانچہ وہ گیٹ کے پاس برقع پہنے کھڑی تھی۔ دونوں فرط مسرت میں آنسو بہانے لگے۔ شیدے نے تانگہ لیا۔ دونوں اس میں سوار ہوئے اور شہر کی جانب چلے۔ لیکن شیدے کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ زلیخا کو کہاں لے جائے گا۔ زلیخا تمہیں کہاں جانا ہے۔

زلیخا نے جواب دیا۔

مجھے معلوم نہیں —— تم جہاں لے جاؤ گے ۔ وہیں چل جاؤں گی۔

شیدے نے کچھ دیر سوچا اور زلیخا سے کہا۔

نہیں —— یہ ٹھیک نہیں تم اپنے گھر جاؤ ——
—— دنیا مجھے غنڈہ کہتی ہے لیکن میں تمہیں جائز طریقے پر حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تم سے باقاعدہ شادی کروں گا۔

زلیخا نے پوچھا کب ؟

بس ایک دو مہینے لگ جائیں گے —— میں اپنی جوئے کی بیٹھک پھر سے قائم کروں ۔ اس عرصے میں اتنا روپیہ اکٹھا ہو جائے گا کہ میں تمہارے لیے زیور کپڑے خرید سکوں ——

زلیخا بہت متاثر ہوئی۔

تم کتنے اچھے ہو شیدے جتنی دیر تم کہو گے میں اس گھڑی کے لیے انتظار کروں گی جب میں تمہاری ہو جاؤں گی۔

شیدا ذرا جذباتی ہو گیا جانی تم اب بھی میری ہو ——— میں بھی تمہارا ہوں ——— لیکن میں چاہتا ہوں جو کام ہو طور طریقے سے ہو میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہو دوسروں کی جوان کنواری لڑکیوں کو ورغلا کر خراب کرتے ہیں۔ مجھے تم سے محبت ہے جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تمہاری خاطر میں نے مار کھائی اور قریب قریب دو برس جیل کاٹے۔

خداوند پاک کی قسم کھا کے کہتا ہوں ہر وقت ہونٹوں پر تمہارا نام رہتا تھا۔

زلیخا نے کہا۔

میں نے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی لیکن تمہارے لئے میں نے ایک ہمسائی سے سیکھی اور بلا ناغہ پانچوں وقت پڑھتی رہی ——— ہر نماز کے بعد دعا مانگتی کہ خدا تمہیں ہر آفت سے محفوظ رکھے۔ شیدے نے شہر پہنچتے ہی دوسرا تانگہ لے لیا اور زلیخا سے جدا ہو گیا تاکہ وہ اپنے گھر جائے اور وہ اپنے۔

شیدے نے ڈیڑھ ماہ کے اندر اندر ایک ہزار روپے پیدا کر لئے۔ ان سے اس نے زلیخا کے لیے سونے کی چوڑیاں اور انگوٹھیاں بنوائیں۔ گلے کے لیے ایک نکلس بھی لیا۔ اب وہ پوری طرح لیس تھا۔

ایک دن وہ اپنے گھر میں اوپر سیڑھی پر بیٹھا کھانا کھانے لگا تھا کہ نیچے سے

کسی عورت کے بین کرنے جیسی آواز آئی وہ اُسے پکار رہی تھی اور ساتھ ساتھ کوسنے بھی دے رہی تھی۔

شیدے نے اُٹھ کر کھڑکی میں سے نیچے جھانکا تو ایک بڑھیا تھی جو اس کے محلے کی نہیں تھی اس نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا اور پوچھا کیا تم ہی شیدے ہو۔

ہاں ہاں۔

خدا کرے نہ رہو اس دنیا کے تختے پر ——— تمہاری جوانی ٹوٹے۔ تم پر بجلی گرے۔

شیدے نے کسی قدر غصے میں اس بڑھیا سے پوچھا۔

بات کیا ہے۔

بڑھیا کا لہجہ اور زیادہ تلخ ہو گیا میری بچی تم پر جان چھڑکے اور تمہیں کچھ پتہ ہی نہیں۔

شیدے نے حیرت سے اُس بڑھیا سے سوال کیا کون ہے تمہاری بچی؟

زلیخا اور کون ———

کیوں کیا ہوا اُس کو۔

بڑھیا رونے لگی وہ تم سے ملتی تھی تم غنڈے ہو اس لئے ایک تھانیدار نے زبردستی اس کے ساتھ اپنا منہ کالا کیا۔ شیدے کے ہوش و حواس ایک لمحے کے لیے غائب ہو گئے مگر سنبھل کر اس نے بڑھیا سے پوچھا کیا نام ہے اس تھانیدار کا؟

بڑھیا کانپ رہی تھی یرم داد ——— تم یہاں اُوپر مزے میں بیٹھے ہو بہت بڑے غنڈے بنے پھرتے ہو ——— اگر تم میں تھوڑی سی بھی غیرت ہے تو جاؤ اور اس تھانیدار کا سر گنڈاسے کاٹ کر رکھ دو۔

شیدے نے کچھ نہ کہا۔ کھڑکی سے ہٹ کر اس نے بڑے اطمینان سے کھانا کھایا پیٹ بھر کے دو گلاس پانی کے پیے اور ایک کونے میں رکھی ہوئی کلہاڑی لے کر باہر چلا گیا۔

ایک گھنٹے کے بعد اس نے زلیخا کے گھر دروازے پر دستک دی۔ وہی بڑھیا باہر نکلی ——— شیدے کے ہاتھ میں خون آلود کلہاڑی تھی۔ اُس نے بڑے پرسکون لہجے میں اُس سے کہا ماں ——— جو کام تم نے مجھ سے کہا تھا کر آیا ہوں —— زلیخا سے میرا سلام کہنا ——— میں اب چلتا ہوں یہ کہہ کر وہ سیدھا کوتوالی گیا اور خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

(۳۰ مئی ۱۹۵۲ء)

بڈھا کھوسٹ

یہ جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد کی بات ہے۔ جب میرا عزیز ترین دوست لیفٹیننٹ کرنل محمد سلیم شیخ (اب) ایران، عراق اور دوسرے محاذوں سے ہوتا ہوا بمبئے پہنچا۔ اُس کو اچھی طرح معلوم تھا۔ میرا فلیٹ کہاں ہے ہم میں گاہے گاہے خط و کتابت بھی ہوتی رہتی تھی۔ لیکن اس سے کچھ مزا نہیں آتا تھا۔ اس لیے کہ ہر خط سنسر ہوتا ہے۔ ادھر سے جائے یا اُدھر سے آئے عجیب مصیبت تھی۔ مگر اب ان مصیبتوں کا ذکر کیا کرنا ہے بمبئی کے بی بی اینڈ سی آئی لے کے ٹرمینس پر اُس کی پوسٹنگ ہوئی۔ اُس وقت وہ صرف لیفٹیننٹ تھا ہم دونوں وسیع و عریض ریلوے اسٹیشن کے بوفے میں بیٹھ گئے اور دوپہر کے بارہ ایک بجے تک ٹھنڈی بیئر پیتے رہے۔ اُس نے اِس دوران میں مجھے کئی کہانیاں سنائیں۔ جن میں سے ایک خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

اُس نے ایران عراق اور خدا معلوم کن کن ملکوں کے اپنے معاشقے سنائے ہیں سنتا رہا۔ پیشہ ور عاشق تو کالج کے زمانے سے تھا۔ اُس کی داستانیں اگر میں سنا دوں۔ تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ بہر حال آپ کو اتنا بتانا ضروری ہے کہ اُسے لڑکیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا گُر معلوم تھا۔ گورڈن کالج راولپنڈی میں وہ راجہ اندر تھا۔ اُس کے دربار میں وہاں کی تمام پریاں مجرا عرض کرتی تھیں۔ خوبصورت تھا۔ کافی خوبصورت مگر اُس کا حُسن مردانہ حسن تھا۔ پتلی نکیلی ناک جو یقیناً اپنا کام کر جاتی ہوگی۔ چھوٹی چھوٹی گہرے بھورے رنگ کی آنکھیں جو اُس کے چہرے پر بج گئی تھیں۔ بڑی ہوتیں تو شاید اُس کے چہرے کی ساری کشش ماری جاتی۔

وہ کھلنڈرا تھا۔ جس طرح لارڈ بائرن صرف کچھ عرصے کے لئے کسی سے دلچسپی لیتا تھا۔ اور پھر اُسے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا تھا۔ جیسے وہ اُس کی زندگی میں کبھی آئی ہی نہیں۔ اسی طرح کا سلوک وہ اپنے جال میں پھنسی ہوئی لڑکیوں سے کرتا۔ مجھے اُس کا یہ رویہ پسند نہیں تھا۔ کہ یہ میری نظر میں بہت ظالمانہ ہے مگر وہ بے پرواہ تھا کہا کرتا، اُلّو کے پٹھے ——— غالب پڑھو وہ کیا کہتا ہے ——— اُسے متن یاد کبھی نہیں رہتا تھا مگر اُس کا مفہوم اپنے الفاظ میں ادا کر دیا کرتا ——— وہ کہتا ہے وہی شاخ طوبےٰ اور جنت میں وہی ایک حور ——— واللہ زندگی اجیرن ہو جائے گی ——— شہد کی مکھی بنو کلی

تو ڈوب مرو ——— لیکن تم تیرنا جانتے ہو۔ ڈوبنے کا کام ہم اپنے ذمہ لیتے ہیں۔

شیخ سلیم کو اس قسم کی باتیں عموماً کہا جاتی تھیں ——— اُس نے اپنی مہین مہین مونچھوں کو تاؤ دینے کی کوشش کی اور کہا اچھا تم دیکھ لینا کیا ہوگا اس کی پارٹی کے ایک قوی ہیکل لڑکے نے پوچھا کیا ہوگا۔

شیخ سلیم نے اس کو جھاگ کی طرح بٹھا دیا ——— ہوگا تمہاری ماں کا سر۔ جب شادی کا دن آئے گا دیکھ لینا ——— چلو آؤ میرے ساتھ مجھے تم سے چند باتیں کرنی ہیں۔

———

شادی کا دن آ گیا۔ بارات جب دولہا والوں کے گھر کے پاس پہنچی تو کوئی شخص سر پر سہرے باندھے بڑے اچھے گھوڑے پر سوار اندر داخل ہو گیا۔ دولہا موٹر میں تھا جس پر پھولوں کا جال بنا ہوا تھا۔

گھوڑ سوار سہرے سے لدا پھندا شامیانے کے پاس تھا۔ گھوڑا خود دولہا بنا ہوا تھا۔ دولہن کا باپ اور اس کے رشتہ دار آگے بڑھے۔ گھوڑے کا مالک بھاگا بھاگا آ گیا تھا۔

اس سہرے سے لدے ہوئے آدمی کو اس جگہ بٹھا دیا گیا۔ جہاں دولہن کو بھی ساتھ بیٹھنا تھا۔ بیچ میں ہون کنڈ تھا۔ جس میں چھوٹی چھوٹی لکڑیوں کے ٹکڑے جل رہے تھے۔ انہوں نے ننگے بدن اُٹھ کر دولہا کو آشیرواد دیا اور کہا۔

گل کا رس چوسو — کبھی کسی مصری کی نہ بنو جو وہیں چپک کر رہ جائے۔ پھر اس نے اقبال کے ایک شعر کا حوالہ اپنا بئیر کا گلاس خالی کرتے ہوئے دیا، کیا کہا ہے اقبالؒ نے ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی تھا

ثابت ہوا کہ تم نہ صرف ناداں ہو بلکہ درجہ اوّل بناسپتی گھی کی طرح درجہ اوّل جیفہ بھی ہو ——— اب ہٹاؤ اس بکواس کو۔

میں نے یہ بکواس اس طرح ہٹائی جس طرح بیرے نے میری بیئر کی خالی بوتل۔ پیشتر اس کے کہ میں اصل کہانی کی طرف آؤں میں آپ کو شیخ سلیم سے متعلق ایک بہت دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ ہم گورڈن کالج میں بی اے فائنل میں پڑھتے تھے کہ کرسمس کی چھٹیوں میں ایک رکمنی کی شادی کی اُڑتی اُڑتی افواہ ہمیں ملی۔ یہ رکمنی ہماری ہی کسی کلاس میں پڑھتی تھی اور کچھ عرصہ پہلے بری طرح شیخ سلیم پر فریفتہ۔ شکل و صورت اُس کی واجبی تھی۔ مگر میرا دوست شہد کی مکھی تھا۔ چنانچہ دو مہینے اُن کا معاشقہ چلتا رہا۔ اس کے بعد وہ اس سے بالکل اجنبی ہو گیا۔

جب اُس کو بتایا گیا کہ رکمنی جو تمہاری محبوبہ تھی اور جس کی خاطر تم نے اتنے جھگڑے اپنی کلاس کے طالبعلموں سے کئے۔ وہ اگر دوسری جگہ بیاہی جائے

سردار جی دولہن کو جلد بلائیے۔ مہورت ہو گیا ہے۔ فوراً رکمنی پہنچ گئی اور کچھ عرصے کے لیے دولہا کے ساتھ بٹھا دی گئی۔

پنڈت جی نے کچھ پڑھا۔

جس کا مطلب میری سمجھ میں نہ آیا۔ لیکن ایک دم شادی کے اُس جلسے میں ایک ہڑبونگ سی مچ گئی۔ جب کار سے ایک دولہا نکل کر سامنے آ گیا اور بلند آواز میں تمام حاضرین کو مخاطب کیا۔ میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے ——— میں دعوےٰ دائر کر دوں گا۔

وہ دولہا جو ہاتھ پکڑ کر دولہن کو اُٹھا رہا تھا بڑی خوفناک آواز میں چلایا۔ ابے جا بے دعوے دائر کرنے کے بچہ لگتے۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے پھولوں کا گھونگھٹ اٹھا دیا اور ان ہزار کے قریب آدمیوں سے جو شامیانے کے نیچے تھے کچھ کہنا چاہا مگر قہقہے کا ایک سمندر موجیں مارنے لگا۔

دوسری پارٹی کے آدمی بھی ان قہقہوں میں شریک ہوئے کیونکہ جب یہ پھولوں کا پردہ علیٰحدہ ہوا تو انہوں نے دیکھا کہ شیخ سلیم ہے۔

رکمنی بڑی خفیف ہوئی مگر شیخ سلیم نے بڑی جرأت سے کام لے کر اُس سے بلند آواز میں پوچھا۔

تم اُس بُھندے کے ساتھ شادی کرنے کے لیے تیار ہو رکمنی خاموش رہی۔

اچھا جاؤ جہنم میں۔

لیکن ایک دن نہیں پورے تین مہینے تم ہمیں پوچھتی رہی ہو یہ کہہ کر وہ صیح دولہا کی طرف بڑھا۔ جس کے منہ سے غصّے کے مارے جھاگ نکل رہے تھے آگے بڑھ کر اس نے اپنے سارے ہار اُس کے گلے میں ڈال دیئے۔

سب براتی بت بنے بیٹھے تھے۔ ہنستا قہقہے لگاتا وہ اپنے گھوڑے پر بڑی صفائی سے سوار ہوا اور ایڑھ لگا کر کوٹھی سے باہر نکل گیا۔ گھوڑے سے اُتر کر (ہم دور نکل گئے تھے اس لئے کہ میں اس کے پیچھے گھوڑے کی تیز رفتاری سے بھاگتا تھا) اس نے میرا کاندھا بڑے زور سے ہلایا کیوں بیٹے تم سے میں نے کیا کہا تھا ——— اب دیکھ لیا؟

ہوا تو سب کچھ ٹھیک تھا مگر مجھے ڈر تھا کہیں شیخ سلیم گرفتار نہ ہو جائے میں نے اس سے کہا۔

جو تم نے کیا وہ اور کوئی نہیں کر سکتا لیکن بھائی میرے کہیں جنس میں نہ پھنس نہ ہو جائے فرض کرو اگر رکمنی کے باپ نے تمہیں گرفتار کرا دیا؟

وہ اکڑ کر بولا۔

اس کے باپ کا باپ بھی نہیں کر سکتا ——— کون اپنی بیٹی کو عدالت چڑھانے گا ——— میں تو اسی وقت گرفتار ہونے کے لئے تیار ہوں۔

لے جائے مجھے تھانے ——— اُس سالی کے سارے

پول کھول دوں گا ——— میرے پاس اُس کے درجنوں خطوط پڑے ہیں۔

سارے شہر میں یہی افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ رکمنی کا باپ شیخ سلیم کو ضرور اُس کی گستاخی کی سزا دلوائے گا کہ وہ ساری عمر یاد رکھے۔ مگر کچھ نہ ہوا جب کئی دن گزر گئے تو وہ میرے پاس گاتا ہوا آیا ؎

تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے پر وہ تماشا نہ ہوا

اب میں اصل کہانی کی طرف پلٹتا ہوں جو اس واقعے سے بھی کہیں زیادہ دلچسپ اور معنی خیز ہے ——— یہ خود اس نے مجھے سنائی جس کی صداقت پر مجھے سو فی صد یقین ہے۔ اِس لئے کہ شیخ سلیم جھوٹا کبھی نہیں تھا۔

اس نے مجھے بتایا۔

میں ایران میں تھا وہاں کی لڑکیاں عام یورپین لڑکیوں کی طرح ہوتی ہیں وہی لباس وہی وضع قطع البتہ ناک نقشے کے لحاظ سے کافی مختلف ہوتی ہیں۔ جتنی خرافات وہاں ہوتی ہے شاید ہی کسی اور ملک میں ہوتی ہے ——— میں نے وہاں کئی شکار کیں۔ وہاں میرے ایک بڑے افسر کرنل عثمانی تھے۔ حالانکہ ان کا عہدہ جیسا کہ ظاہر ہے مجھ سے بہت بڑا تھا لیکن وہ میرے بڑے مہربان تھے۔

میس میں جب بھی مجھے دیکھتے دور سے پکارتے ادھر آؤ شیخ میرے پاس بیٹھو ——— اور وہ میرے لئے ایک کرسی منگواتے۔ وسکی کا دور چلتا تو ادھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیتے۔

کرنل عثمانی صاحب کو مجھ سے چھیڑ خانی کرنے میں خاص مزا آتا ——— جب وہ کوئی فقرہ مجھ پر چست کرتے تو بہت خوش ہوتے۔ کافی عمر آدمی تھا۔ اس کے علاوہ بڑا افسر میں خاموش رہتا۔ اُن کو اُن پولستانی نرسوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ جو وہاں ایمبولنس کور میں کام کرتی تھیں۔

یہ پولستانی لڑکیاں بلا کی تنومند ہوتی ہیں ——— یہ موٹی موٹی پنڈلیاں بڑی مضبوط۔ چھاتیاں بڑی بڑی اور صحت مند۔ کولہے چوڑے اور گوشت سے بھرے ہوئے جن میں سختی ہو ——— لوہے ایسی سختی ——— میری کئی دوست تھیں۔ پر جب میں آئرن سے ملا تو سب کو بھول گیا۔ سارے ایران کو بھول گیا۔ بڑی صفتیں تھیں۔ نقش سب چھوٹے چھوٹے تھے اگر تم اُس کی چھاتیوں اور پنڈلیوں کو پیش نظر رکھتے تو یہی سمجھتے کہ اس کے ہاتھ ڈبل روٹی کے مانند ہوں گے۔ اس کی انگلیاں اتنی موٹی ہوں گی۔ جیسے کسی درخت کی ٹہنی۔ مگر نہیں دوست اس کے ہاتھ بڑے نرم و نازک تھے اور اس کی انگلیاں تم یہ سمجھو کہ چغتائی کی بنائی تصویروں کی طرح مخروطی لانبی نہیں مگر پتلی پتلی تھیں ——— میں تو اس پر فریفتہ ہو گیا۔

چند روز کی ملاقاتوں ہی میں اُس کے میرے تعلقات بے تکلفی کی حد تک بڑھ گئے۔ یہاں تک پہنچ کر شیخ رُک گیا۔ ایک نیا پیگ گلاس میں ڈالا اور سوڈا ملا کر غٹاغٹ پی گیا نہ یاد کراؤ یہ قصہ۔ میں نے اس سے کہا۔ لیفٹننٹ صاحب آپ نے خود ہی تو شروع کیا تھا۔ اس نے ماتھے پر تیوری چڑھا کر میری طرف دیکھا ایک اور پیگ اپنے گلاس میں ——— تین چار پیگ جو بوتل میں باقی بچ گئے تھے۔

انتقاماً میرے گلاس میں ڈالے اور خود وسکی جسے انگریزی میں نیٹ کہتے ہیں پی گیا اور کھانس کھانس کر اپنا بُرا حال کر لیا۔ لعنت ہو تم پر۔

یعنی یہ کیا موقعہ تھا مجھ پر لعنت بھیجنے کا۔

اس کی کھانسی بند ہو گئی تھی اب۔ اور وہ رومال سے اپنا منہ پونچھ رہا تھا کچھ نہ پوچھو میری جان ———

دوسرے روز رات کو کرنل صاحب سے ملاقات ہوئی۔

انہوں نے بڑے طنز سے کہا۔

شہزادے مجھے تم بڈھا سمجھتے ہو۔ وہ تم نے ضرب المثل نہیں سنی کیا ایک دن بُڈھا نا سو دن ——— میں نے اُن سے عرض کی کرنل صاحب آپ کا میرا کیا مقابلہ ——— مگر میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ یہ کمبخت اس حقیقت سے اب تک غافل ہے کہ قبر میں پاؤں لٹکائے

بیٹھا ہے اور عشق فرما رہا ہے۔

میں تو خدا کی قسم جب اس عمر کو پہنچوں گا تو خودکشی کروں گا —— اس منہ کے ساتھ جس میں آدھے دانت مصنوعی ہیں میری آئرن پر نگاہیں لگائے بیٹھا ہے۔

کرنل ہوگا تو اپنے گھر میں۔

اس نے پھر کبھی اس کی بات کی تو ایک گھونسہ جماؤں گا اس کی سوکھی گردن پر کہ منکا باہر آ جائے گا۔

دیر تک اس بڈھے کھوسٹ سے آئرن —— نہایت ہی پیاری آئرن کے متعلق باتیں ہوتی رہیں اور وہ طنز کرنے سے باز نہ آیا۔

وسکی کا چوتھا دور چل رہا تھا۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر بڑی فرمانبردار قسم کی مسکراہٹ پیدا کی اور اس سے کہا۔

کرنل صاحب جو آپ کو بڈھا کہے وہ خود بڈھا ہے۔ آپ تو ماشاءاللہ دھان پان ہیں یہ محفل ختم ہوئی تو میں بہت خوش ہوا۔

آئرن نے مجھ سے وعدہ کیا۔

کہ وہ دوسرے روز فلاں فلاں ہوٹل میں شام کو سات بجے ملے گی۔

اس میں فوجیوں کو اجازت تھی۔

اتوار تھا اس لئے میں وردی کے بجائے نہایت اعلیٰ سوٹ پہن کر وہاں پہنچا سات بجنے میں ابھی نو منٹ باقی تھے۔

میں ڈائننگ ہال میں داخل ہوا تو میرے پاؤں وہیں کے وہیں جم گئے۔ کرنل عثمانی صاحب اس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے غافل آئرن کا بڑا لمبا بوسہ لے رہے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اس کرنل سے کہیں زیادہ بڈھا کھوسٹ بن گیا ہوں۔

(۳۱ مئی ۵۵ء)